فکر و نظر

یالیت قومی یعلمون

ان دنوں سیاست دانوں اور سول اور ملٹری بیوروکریسی کی کرپشن کے قصے ہر فرد کی زبان پر ہیں۔ قتل و غارت گری عام ہے، تین تین سال کی بچیوں کے ساتھ زنا بالجبر کے واقعات عام ہو رہے ہیں۔ کئی لوگ بے روزگاری اور بھوک سے تنگ آ کر خودکشی کر رہے ہیں۔ ضمیر فروش دہشت گردوں کے گروہ ہر صوبے میں دندنا رہے ہیں..... غرض مادہ پرستی، بداخلاقی، بددیانتی، اضطراب اور بے سکونی کا ایک عفریت ہے جس نے افراد معاشرہ کو اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔

اور بدقسمتی یہ کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں اس طوفان سے بچنے کا خیال ہے اور امت کو اس خوفناک بحران سے نکالنے کی تڑپ جن کے اندر موجود ہے۔

ہمارے نزدیک اس بڑھتے ہوئے اخلاقی بحران کا سبب یہ ہے کہ اس معاشرے میں سارے کام ہو رہے ہیں لیکن جو کام نہیں ہو رہا وہ انسان سازی کا کام ہے، وہ مسلمان سازی کا کام ہے، وہ کردار سازی کا کام ہے۔ یہ کام تبھی ہو سکتا ہے جب دلوں میں ایمان کی آبیاری کی جائے، لوگوں کے دلوں میں آخرت کا خوف پیدا کیا جائے، رزائل اخلاق سے بچنے اور فضائل اخلاق پر عمل کرنے کی ان کی ٹھنڈے دل سے برسوں تربیت کی جائے۔

یہ کام درس گاہوں میں ہوتا ہے اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہوتا ہے لیکن ہم نے ان دونوں اداروں کو تعمیر کی بجائے تخریب کی راہ پر لگا رکھا ہے۔ دونوں شعبوں پر اسلام اور مسلم دشمن مغربی فکر و تہذیب کا رنگ غالب ہے۔ دشمن ان میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے کثیر سرمایہ کاری کر رہا ہے اور ترغیب و ترہیب کا ہر ہتھکنڈہ استعمال کر رہا ہے اور یہ سب کچھ وہ ہمارے ہاتھوں کرا رہا ہے لیکن ہم بے حس اور خواب غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اے وہ لوگو! جو ملت کا درد رکھتے ہو، جو اس کی کشتی کو ڈوبنے سے بچانا چاہتے ہو! اگر تم اصلاح احوال کے خواہاں ہو تو انسان سازی کی فیکٹریاں لگاؤ، کردار سازی کا کام کرو۔ اپنے تعلیمی نظام اور تعلیمی اداروں کی اصلاح کرو۔ ان سے تعمیر شخصیت کا کام لو۔ تعلیم و تزکیے کا یہ کام قرآن کا حکم ہے، یہ پیغمبروں کی سنت ہے، یہ قوموں کی اصلاح و بگاڑ کا پیمانہ ہے۔ اگر یہ کام کرو گے تو اچھے انسان بنیں گے، اچھا معاشرہ بنے گا اور اچھی ریاست وجود میں آئے گی اور اگر یہ کام نہیں کرو گے تو تباہی تمہارا مقدر ہوگی۔ یہ بات سمجھنے کے لیے بقراط کی عقل کی ضرورت ہے نہ افلاطون کی فراست کی، قرآن حکیم کی ایک آیت ہی اس کے لیے کافی ہے۔ **یالیت قومی یعلمون**

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

پاکستانی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علومِ اسلامیہ میں تحقیق کی زبوں حالی

'اسلامی علوم میں تحقیق کے جدید مناہج' کے موضوع پر سرگودھا یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ نے ۸ اور ۹ جون ۲۰۱۵ء کو دوروزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا اور اس میں سینئر اساتذہ کے مقالات وخطابات کا اہتمام کیا۔ مدیر البرہان نے اس موقع پر جو گفتگو کی وہ بعض حک و اضافے کے ساتھ نذر قارئین ہے۔ ہماری روایت کے مطابق اگر کوئی صاحب اس موضوع کے حق میں یا اس کے خلاف کچھ لکھنا چاہیں یا ڈاکٹر صاحب کی تحریر پر تبصرہ کرنا چاہیں تو ہمارے صفحات حاضر ہیں۔ ادارہ

حمد وثناء کے بعد! ہمیں دیے گئے موضوع 'اسلامی طرز تحقیق کی اہم خصوصیات' کے موضوع کو تھوڑا سا تبدیل کر کے ہم نے اسے ایک سوال کی شکل دے دی ہے کہ کیا ہماری یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ میں اچھی تحقیق ہو رہی ہے؟ لیکن اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہم اپنے بعض تجربات آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ زیر بحث موضوع پر کچھ روشنی بھی ڈالیں گے اور تحقیق جیسے ٹھوس اور خشک موضوع پر گفتگو کو دلچسپ بنانے میں میری اور آپ کی مدد بھی کریں گے۔

۱- سعودی عرب میں کئی سال عربی میڈیم میں تعلیم حاصل کر کے جب ہم نے فقہ واصول فقہ میں ایم اے (ماجستیر) کر لیا تو ہمیں شوق پیدا ہوا کہ اب مغربی یونیورسٹیوں اور پروفیسروں سے استفادہ کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے UK کی ایک پرائیویٹ یونیورسٹی سے رابطہ کیا جس نے ہمارے موضوع کی مناسب سے لندن یونیورسٹی کے 'سکول آف اوری اینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز' کے شعبۂ اسلامی قانون کے پروفیسر نوئل کلسن کو ہمارے مجوزہ پی ایچ ڈی تھیسز کی نگرانی کے لیے آمادہ کر لیا۔ پروفیسر موصوف اس وقت مغربی دنیا میں اسلامی قانون کے شعبے میں سند کی حیثیت رکھتے تھے اور فقہ اسلامی پر کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ میں نے انہیں 'اسلام میں اجتہاد اور قانون

سازی-ایک تقابلی مطالعہ' کے موضوع پر خطۃ البحث (Synopsis) بھجوایا جوانہوں نے یہ کہہ کر ردّ کر دیا کہ مغربی قانون میں تمہارا مطالعہ اتنا وسیع نہیں کہ تم پی ایچ ڈی کی سطح کا تحقیقی کام کرسکو۔ دوسرے یہ کہ مسلمان چودہ صدیوں سے اجتہاد کر رہے ہیں اور اس پر لکھ رہے ہیں لہٰذا اس میں بھی کوئی قابل لحاظ اچھا تحقیقی کام نہیں ہوسکتا۔ میں نے اصرار کیا کہ عصر حاضر میں اجتہاد کی ضرورت و اہمیت ایک اچھا موضوع ہے اور اس پر کام کی گنجائش موجود ہے۔ انہوں نے کہا کہ عصر حاضر میں اجتہاد (Scope of Ijtehad) پر ایک تحریر لکھ کر بھیجو۔ میں نے پوری محنت کر کے وہ تحریر بھجوا دی لیکن پروفیسر صاحب نے اسے بھی ردّ کر دیا اور کہا کہ اس موضوع پر کسی تازہ تحقیق کی ضرورت نہیں، میں نے مجبوراً بعض دوسرے موضوعات بھیجے جن میں سے ایک پروفیسر صاحب نے منظور کرلیا اور میں نے اس پر کام شروع کر دیا۔

اس بات کو غالباً دو سال گزر گئے۔ میں ابھی ریاض سعودی عرب میں ہی تھا اور ایک دن عصر کے بعد سعودی ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ 'مقامی خبروں' کا پروگرام لگ گیا جس میں یہ دکھایا جا رہا تھا کہ جامعہ محمد بن سعود الاسلامیہ کے ایک محقق نے اجتہاد کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے آج اس کا امتحان اور پبلک ڈیفنس ہے۔ پھر ہم نے حیرانی سے دیکھا کہ اساتذہ اور مذکورہ محقق ہال میں داخل ہوئے اور ایک ملازم ایک 'ہاتھ ریڑھی' جس میں ہمارے ہاں عام طور پر اینٹیں ڈھوئی جاتی ہیں، دھکیل کر لا رہا تھا جس میں بڑی تقطیع کی دو ضخیم جلدوں میں مقالہ لادا گیا تھا کیونکہ وہ اتنا وزنی تھا کہ مذکورہ محقق کے لیے اسے اٹھا کر لانا دشوار تھا۔

۲- ہمارے ریاض میں قیام کے دوران مدیر تکبیر محمد صلاح الدین صاحب (اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) سے دوستی ہوگئی تھی چنانچہ راقم جب لاہور منتقل ہوگیا تو جب وہ کراچی سے لاہور آتے تو وہ مجھ سے رابطہ کرتے اور میں دن بھر ان کو دوستوں سے ملوانے میں ان کا ساتھ دیتا۔ ایک دن انہوں نے مجھے فون کیا اور اپنے ایک دوست کا پیغام کہیں فوراً پہنچانے کو کہا جو گلبرگ میں حسین چوک لبرٹی کے قریب ایک سرکاری رہائش گاہ میں مقیم تھے۔ سوئے اتفاق سے اس وقت میرے پاس سواری موجود نہ تھی۔ جون کے آخری دن، دوپہر کا وقت اور شدید گرمی۔ میں نے رکشے سے اتر کر مکان تلاش کرنا شروع کیا اور پسینے سے شرابور ہوگیا۔ خدا خدا کر کے اس نام کی تختی ایک مکان پر مل گئی اور میں نے گھنٹی بجا دی۔ قدرے تاخیر کے ساتھ داڑھی مونچھ کے بغیر ایک بزرگ تشریف لائے اور گرمی سے میرا برا حال دیکھ کر بغیر کچھ پوچھے اندر لے

گئے۔ کمرہ ٹھنڈا تھا ائیر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ انہوں نے مجھے ٹھنڈا پانی پلایا اور سانس لینے کے بعد اس دوپہر گردی کا سبب پوچھا۔ پتہ چلا وہ مطلوبہ آدمی نہ تھے۔ بہرحال انہوں نے مجھے تھوڑی دیر ستانے کے لیے کہا اور اس دوران ایک دوسرے سے تعارف ہوگیا۔ وہ حال ہی میں اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کے منصب سے ریٹائر ہوئے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ پنجاب یونیورسٹی کے دائرہ معارفِ اسلامیہ سے وابستہ ہوں۔ انہوں نے پوچھا یہ ادارہ کیا کام کرتا ہے؟ تو میں نے کہا 'اسلام پر تحقیق' وہ کہنے لگے 'اسلام پر تو کوئی تحقیق ہو ہی نہیں سکتی'۔ مجھے یہ تبصرہ عجیب لگا اور میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا 'کیوں نہیں ہوسکتی؟' کہنے لگے کہ اگر میں کہوں کہ خدا ایک نہیں دو ہیں اور تحقیق سے اسے ثابت کرنے کی کوشش کروں تو کیا آپ کا ادارہ مجھے اس تحقیق کی اجازت دے گا؟ میں نے کہا 'مشکل ہے'۔ کہنے لگے 'اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ اسلام میں تحقیق کی گنجائش ہی نہیں ہے۔'

۳۔ دسمبر ۱۹۸۹ء میں پاکستان میں امریکی سفارت خانے نے امریکی محکمہ اطلاعات کی مدد سے پاکستانی پروفیسروں اور دانشوروں کے ایک آٹھ رکنی وفد کو دورۂ امریکہ کی دعوت دی تاکہ وہ 'امریکہ میں اسلام' کا عملی مشاہدہ کرسکیں۔ راقم الحروف بھی اس وفد کا ایک رکن تھا۔ ہم لوگ جب پہلے دن واشنگٹن میں اکٹھے ہوئے تو ہم نے سنت کے مطابق پروفیسر ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری صاحب (اُس وقت ڈائریکٹر جنرل ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد) کو امیر وفد مقرر کرلیا۔ اس طویل سفر کا آخری پڑاؤ، ڈیٹرائٹ میں امریکی مسلم ماہرین عمرانیات (American Muslim Social Scientists) کی دوروزہ کانفرنس تھی۔ یاد رہے یہ ایسوی ایشن ایک اعلیٰ پائے کا بین الاقوامی تحقیقی جریدہ American Journal of Islamic Sociel Sciencs بھی شائع کرتی ہے جس میں اسلامی علوم سے متعلق اہم مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر انصاری صاحب کا کلیدی خطاب تھا چنانچہ ہم نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی۔ منتظمین نے ایک سیشن 'پاکستانی یونیورسٹیوں میں علوم اسلامیہ پر تحقیق' بھی رکھا (کیونکہ ہمارے وفد کے زیادہ تر لوگ یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ سے وابستہ تھے) جس میں ہمارے وفد کے ارکان کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی موضوع پر بحث کی۔ سیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ پاکستانی یونیورسٹیوں کے شعبۂ ہائے علوم اسلامیہ میں اچھا معیاری تحقیقی کام نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ ماحول پر روایتی علماء کا دباؤ ہے جس میں تقلید اور Status quo برقرار رکھنے کا رجحان غالب ہے۔

۴۔ نیپا (نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن لاہور۔ اب اس ادارے کا نام کچھ اور

ہوگیا ہے) سی ایس پی افسروں کی تربیت کا ایک ادارہ ہے۔اس میں'پاکستان کی اسلامائزیشن' پر ہمارا لیکچر تھا۔دوران تقریر جب قانون سازی کی اسلامائزیشن کا ذکر ہوا تو ہم نے اجتہاد اور شرائط مجتہدین کا بھی ذکر کیا۔لیکچر کے بعد ایک صاحب نے کہا کہ چند دن پہلے ایس ایم ظفر صاحب (معروف قانون دان) کا لیکچر تھا اور انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ اگر عربی نہ آتی ہو تو قرآن حکیم کا ترجمہ دیکھ کر بھی اجتہاد کیا جاسکتا ہے۔ہم نے کہا'آپ میں سے کتنے لوگ ایم اے انگلش ہیں'؟ کئی لوگوں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ہم نے کہا'آپ میں سے کوئی اگر انگلش لٹریچر میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے انگلینڈ جائے اور فرض کیجیے کہ شیکسپیئر کے ڈراموں پر پی ایچ ڈی کرنا چاہے تو کیا وہ ایسا کرسکتا ہے اگر اسے انگریزی زبان نہ آتی ہو؟'سب نے کہا 'یہ ممکن نہیں' ہم نے کہا تو کیا خدا کی کتاب ہی اتنی ہلکی اور مظلوم ہے کہ آپ کو اس کی زبان نہ آتی ہو تو پھر بھی اس کے الفاظ کی باریکیوں اور اس کے مفاہیم کی دقیقہ سنجیوں پر آپ بحث کریں؟ تو سب خاموش ہوگئے۔پھر ہم نے کہا کہ یہ نظام تعلیم کا قصور ہے کہ آپ کو عربی نہیں پڑھائی جاتی ورنہ آپ جیسے ذہین لوگ جس طرح انگریزی میں اچھے ہیں،اسی طرح عربی میں بھی اچھے ہوتے۔دوسری طرف عربی آتی ہے ان بوریہ نشین مولویوں کو جو مدرسوں کی چٹائیوں پر پڑھتے پڑھاتے ہیں۔یہ تاریخ کا جبر ہے اور اسے بدلنے کا کام بھی آپ ہی کو کرنا چاہیے۔ورنہ اس طرح کے لطیفے جنم لیتے رہیں گے کہ ہم نے اسلام آباد میں وزارت قانون کے اس انڈر سیکرٹری سے پوچھا جس نے حدود قوانین کا مسودہ تیار کیا تھا کہ کیا آپ کو عربی آتی ہے تو اس نے کہا'نہیں'۔اور ایک پی ایچ ڈی ڈاکٹر صاحب نے'حسن تفسیر' کے نام سے ایک ضخیم تفسیر لکھی ہے اور اس کے مقدمے میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اگر کسی کو عربی نہ آتی ہو اور وہ تفسیر لکھنا چاہے تو اس کا طریقہ کیا ہے؟

۵-یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور نے حال ہی میں Inferential Statstics کا مضمون عمرانی علوم (خصوصاً بزنس وفنانس) میں تحقیق کے ہر طالب کے لیے لازمی کردیا ہے تاکہ طلبہ کو مغربی طرز تحقیق خصوصاً Quantitative Research میں، جسے سائنٹفک ریسرچ سمجھا جاتا ہے اور جس کی بنیاد تجربہ ومشاہدہ اور Data analysis پر ہوتی ہے، طاق کردیا ہے۔

معاف کیجیے گا! تمہید طولانی ہوگئی۔اب ہم صلب موضوع کی طرف آتے ہوئے اس سوال کا جواب دیتے ہیں، جو ہم نے اپنی گفتگو کی ابتداء میں اٹھایا تھا کہ'کیا ہماری یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ میں اچھی تحقیق ہورہی ہے؟'اور ہمارا جواب یہ ہے کہ نہیں ہورہی۔کیوں نہیں ہورہی؟ آیئے اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں؟

۱- ناقص تربیت

ہماری یونیورسٹیوں میں طرق تحقیق یا منہج تحقیق (Research Methodology) کے عنوان سے جو کورس ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ کو پڑھایا جاتا ہے وہ ناقص اور غیر موثر ہے۔ اس میں ایک تو روٹین کی باتیں سکھائی جاتی ہیں کہ تحقیقی مقالہ کیسے لکھا جاتا ہے؟ خطۃ البحث کس طرح تیار کیا جاتا ہے اور حوالہ کس طرح دیا جاتا ہے وغیرہ۔ دوسرے اس میں تحقیق سے متعلق ساری باتیں وہ ہیں جو مغرب سے درآمدہ ہیں اور اسلامی تناظر سے محروم ہیں، مثلاً یہی بات کہ اسلام میں تحقیق کا سکوپ کیا ہے اور اس کی ترجیحات کیا ہے؟ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے، جو ایک نابغۂ روزگار مفکر اور ماہر تعلیم تھے، اس موضوع پر ایک شاندار کتابچہ لکھا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہمیں مکینیکل ریسرچ کی نہیں کری ایٹو (Creative) ریسرچ کی ضرورت ہے۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ کوئی ادارہ ملک کے ایسے ممتاز اسلامی دانشوروں اور ماہرین تعلیم کو جمع کرے جو صاحبِ الرائے ہوں اور اپنی سوچ رکھتے ہوں (نہ کہ مغرب کی نقالی ہی کو منتہائے علم و فن سمجھتے ہوں)۔ وہ صرف اس موضوع پر غور کرنے کے لیے سر جوڑ کر کسی جگہ تین چار دن کے لیے بیٹھیں اور اس وقت تک کہیں نہ جائیں جب تک اسلامی علوم میں 'منہج تحقیق' کا ایک موزوں اور موثر کورس مدوّن نہ کر لیا جائے۔

۲- بنیادی مراجع تک عدم رسائی

طلبہ کی عموماً بنیادی مآخذ (Primary Sources) تک رسائی نہیں ہوتی اور ان کی تحقیق کا انحصار ثانوی مآخذ پر ہوتا ہے۔ کتابوں کی تلاش وحصول بھی ایک مسئلہ ہے لیکن اس سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اکثر طلبہ کو اچھی عربی آتی ہے اور نہ اچھی انگریزی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایک طالب علم اچھا اسلامی سکالر بن ہی نہیں سکتا، عمدہ تحقیق کر ہی نہیں سکتا جب تک اسے عربی پر عبور نہ ہو اور وہ عربی مآخذ سے براہ راست استفادہ نہ کر سکتا ہو۔ اسی طرح ہمارے زمانے میں کہ متداول علوم کا بہت بڑا ذخیرہ انگریزی زبان میں ہے۔ مغرب میں اسلام اور مسلمانوں پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور مغربی فکر وتہذیب مسلم علوم اور معاشرے پر شدت سے اثر انداز ہو رہی ہے اور اس کی تفہیم اور اس کے علمی وفکری چیلنج سے نمٹنے کے لیے انگریزی پر دسترس ناگزیر ہے لہٰذا انگریزی سے عدم واقفیت اچھی تحقیق میں بلاشبہ ایک رکاوٹ ہے۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں کسی کو اس امر کا احساس تک نہیں۔ اگر ہو تو پی ایچ ڈی بلکہ ایم فل علوم اسلامیہ میں بھی داخلہ کے لیے عربی وانگریزی میں پیشگی مہارت کی شرط رکھی جاسکتی ہے لیکن کوئی یونیورسٹی اس کا اہتمام نہیں کرتی۔ اس کے لیے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایم اے اسلامیات میں صرف ان طلبہ کو داخلہ دیا جائے جو عربی وانگریزی میں نہ صرف ڈگری رکھتے ہوں بلکہ عملاً ان پر دسترس بھی رکھتے ہوں یا کم از کم ایم اے اسلامیات میں عربی وانگریزی کی تدریس لازمی کر دی جائے تاکہ فارغ التحصیل ہونے تک طلبہ کو ان زبانوں میں ضروری مہارت حاصل ہو جائے۔ چونکہ ہزاروں طلبہ ایم اے کر چکے ہیں اور ایم فل علوم اسلامیہ میں داخلہ کے خواہش مند ہیں تو چلیے اس مرحلے پر ہی، اگرچہ یہ مرحلہ زبانوں کی تدریس کے لیے غیر موزوں ہے، عربی وانگریزی کی تدریس کا انتظام کورس ورک کے پورے سال میں کر دیا جائے تاکہ ان کی یہ کمی پوری ہو جائے۔

۳- ذوق وشغف

اچھی تحقیق صلاحیت کے علاوہ ذوق، شغف اور رجحان (Aptitude) کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ آج کل لوگوں کی اکثریت اس لیے یم فل اور پی ایچ ڈی کرتی ہے تاکہ انہیں ملازمت ملنے میں آسانی ہو جائے۔ جو ملازم ہیں ان کو ماہانہ الاؤنس مل جائے یا اگلے درجے میں ترقی مل جائے۔ ان محرکات کی بناء پر وہ روپیٹ کے ڈگری کی خاطر برا بھلا مقالہ لکھ کر امتحان پاس کر لیتے ہیں اور بس۔ اصلی چیز یہ ہے کہ طالب علم میں تحقیق کا ذوق پیدا ہو جائے، یہ اس کا شوق اور Passion بن جائے اور اس کا ساری زندگی کا مشغلہ اور عادت بن جائے۔ اس ذوق کی آبیاری میں استاد کا کردار اہم ہے۔ وہی استاد طالب علم میں تحقیق کا ذوق پیدا کر سکتا ہے جو خود محقق ہو اور تحقیق جس کا مستقل ذوق اور رجحان بن چکی ہو۔

تحقیق کے ذوق کی ایک بنیادی ضرورت ہے تنقیدی سوچ (critical thinking) رکھنا یعنی ہر بات میں کیوں اور کیسے کا رجحان اور کثرت سے سوال کرنے اور اٹھانے کی عادت۔ ہمارے ایک استاد، اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے، کہا کرتے تھے کہ ۹۸ فی صد لوگوں کو سوال کرنا نہیں آتا اور ۹۹ فی صد لوگوں کو جواب دینا نہیں آتا۔ تحقیق کا طالب علم وہ ہے جو کثرت سے سوال کرے، خود سے بھی اور دوسروں سے بھی اور پھر ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لیے نکل کھڑا ہو اور کمر ہمت باندھ لے۔

تحقیق کا طالب علم کبھی 'بے رائے' نہیں ہوسکتا۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے کئی طالب علم

میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں 'سر مجھے کوئی موضوع بتایئے' ایسے طالب علموں کی میں کبھی حوصلہ افزائی نہیں کرتا بلکہ انہیں کہتا ہوں کہ اپنی سوچ اور ترجیح کے مطابق تین چار موضوعات لے کر آؤ اور وہ بھی لکھ کر، زبانی نہیں، پھر بات کریں گے۔ ان موضوعات پر گفتگو کے دوران ہی موضوع اکثر فائنل ہو جاتا ہے۔

۴- انٹرنیٹ کا استعمال

کتاب خانوں اور لائبریریوں کے علاوہ آج کل لاسلکی مراجع (Digital Sourses) بھی اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ ہر موضوع پر ہزاروں کتابیں اور تحقیقی مضامین انٹرنیٹ پر موجود ہیں اور ایسے سرچ انجن اور ادارے موجود ہیں جو متعلقہ کتب و تحقیقی مضامین تک آپ کو رسائی مہیا کرتے ہیں اور یہ سہولت صرف انگریزی ہی میں نہیں عربی میں بھی موجود ہے۔ علوم القرآن، علوم الحدیث، فقہ اور اصول فقہ اور دوسرے اسلامی علوم کی ہزاروں کتابوں کے متون انٹرنیٹ پر موجود ہیں جن سے استفادے کا زیادہ رجحان ابھی ہمارے ہاں ترقی نہیں پا سکا۔ متعلقہ قرآنی آیات و احادیث کی تلاش کا کام بھی اب انٹرنیٹ نے آسان کر دیا ہے۔ منہج تحقیق کے کورس کی تدریس کے دوران لائبریری اور انٹرنیٹ سے عربی اور انگریزی مراجع سے استفادے کی طلبہ کو باقاعدہ مشق کرائی جانی چاہیے۔

اردو میں انٹرنیٹ پر کتابیں اور مضامین ابھی تک کم ہیں۔ وکی پیڈیا (Vikipedia) اور گوگل نے اردو میں کام کی ابتداء کر دی ہے۔ حکومت پاکستان کا فرض ہے کہ اس غرض سے خطیر فنڈز مہیا کرے بلکہ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اس کے لیے قومی سطح کا ایک ادارہ بنا دینا چاہیے۔ اردو میں اسلامی علوم پر ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ اگر وہ سب انٹرنیٹ پر مہیا ہو جائے تو یہ علم کی ایک بڑی خدمت ہوگی اور علم و تحقیق کے فروغ میں اہم کردار ادا کرے گی۔

اسی طرح ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ پاکستانی یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر ہر مضمون میں جتنا تحقیقی کام ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے وہ انٹرنیٹ پر آ جائے۔ اس سے موضوعات کے اعادے (Duplication) سے بچا جا سکے گا اور طلبہ کو موضوع کے انتخاب کے وقت پتہ چل جائے گا کہ کن موضوعات پر پہلے کام ہو چکا ہے اور کن نئے موصوعات پر کام کی گنجائش ابھی موجود ہے۔ یہ کام HEC یا کوئی باوسائل پبلک سیکٹر یونیورسٹی کر سکتی ہے۔

۵-موضوعِ تحقیق (Research Topic)

یہ تحقیق کے ہر طالب علم کا مسئلہ ہے کہ وہ اپنے موضوعِ تحقیق کا انتخاب و تعین کیسے کرے؟ بلکہ یہ اساتذہ کا مسئلہ بھی ہے کیونکہ موضوعِ تحقیق کے انتخاب و تعین کے لیے ہر طالب علم کسی نہ کسی استاد کے پاس ہی جاتا ہے۔ ہر یونیورسٹی کے شعبۂ علوم اسلامیہ کو چاہیے کہ وہ اپنی ترجیحات کے مطابق اپنے اساتذہ سے مجوزہ موضوعاتِ تحقیق کی ایک فہرست بنوا کر شعبے کی ویب سائٹ پر رکھوا دے تا کہ طلبہ ان سے استفادہ کر سکیں۔ HEC ایسے موضوعات کی فہرستوں کو یکجا کر کے ایک جامع (Censolidated) فہرست طلبہ کی سہولت کے لیے اپنی ویب سائٹ پر آن لوڈ کر سکتی ہے۔

- ہر تعلیمی ادارے، شعبے اور اس کے سربراہ کی تحقیق میں کچھ ترجیحات ہوتی ہیں اور ہونی چاہئیں۔ یہاں ہم بطور نمونہ تحقیق میں اپنی کچھ ترجیحات آپ کے سامنے رکھتے ہیں:

۱- اسلام اور مغربی فکر و تہذیب

یہ ایک وسیع ایریا اور تھیم (Theme) ہے جس میں کئی جہات سے کام کی ضرورت ہے مثلاً:

i- بدقسمتی سے ابھی تک ہمارے نظامِ تعلیم اور ہمارے علمی و تحقیقی اداروں میں مطالعۂ مغرب (Occidentalism) کا رجحان پیدا نہیں ہوا جو ہماری نالائقی اور بے حسی کا زندہ نمونہ ہے جب کہ کسی بھی زندہ تہذیب اور معاشرے کا جب دوسری تہذیب اور فکر سے تعامل (Inter action) ہو اور واسطہ پڑے تو پہلی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ اسے جانا جائے، اسے سمجھا جائے اور اس کی تفہیم حاصل کی جائے لیکن ہماری یونیورسٹیوں میں اور ہمارے دینی مدارس میں مغربی فکر و تہذیب کے مطالعے کا کوئی اہتمام نہیں اور ہمارے علمی و تحقیقی اداروں میں اس پر تصنیف و تالیف کا کوئی چلن نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ علوم اسلامیہ کے اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت یہ جانتی ہی نہیں کہ مغرب کی فکری تحریکیں جیسے تحریک نشأۃ ثانیہ (Renaissance)، تحریک اصلاح مذہب (Reformation)، تحریک تنویر (Enlightenment)، جدیدیت (Modernity) اور مابعد جدیدیت (Post-modernity) کیا ہیں؟ اسی طرح ہمارے 'پڑھے لکھے' لوگوں کی اکثریت مغربی افکار کے بارے میں نہیں جانتی کہ ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم، سائنٹزم، انڈی وجیولزم، لبرلزم، پازیٹوازم...... وغیرہ کیا ہیں؟ اسی طرح ہمارے مذہبی لوگ اہم مغربی فلاسفہ اور مفکرین کی آراء سے ناواقف ہیں جیسے دیکارت، کانٹ، لاک، ہوبز، ہیگل، نطشے، سارتر وغیرہ کی فکر سے وہ

آ گاہ نہیں حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نہ صرف مغربی فکر وتہذیب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ دنیائے فکر میں تموج کا سبب بنے ہیں۔

ii- اسلام اور مغربی فکر وتہذیب کا تقابلی مطالعہ کیا جانا چاہیے مثلاً مغربی فکر وتہذیب میں تصور انسان کیا ہے اور اسلام کا تصور انسان کیا ہے؟ ان کا تصور دنیا کیا ہے اور ہمارا تصور دنیا کیا ہے؟ اس طرح کا تقابلی مطالعہ دونوں تہذیبوں اور ان کے بنیادی افکار کی تفہیم میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔

iii- مغربی فکر وتہذیب مسلمانوں کے لیے ایک علمی وفکری چیلنج بھی رکھتی ہے۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام واحد سچا دین ہے اور قیامت تک کے لیے قابل عمل ہے تو مسلم اساتذہ، محققین اور دانشوروں کو اسے اعلیٰ علمی سطح پر پیش کرنا ہوگا اور اس کی خوبیوں کو دنیا کے سامنے ثابت کرنا ہوگا۔ اسی طرح اگر ان کا ادعا یہ ہے کہ مغربی فکر وتہذیب انسانیت کے لیے باعث ضرر ہے، وہ غیر فطری اور غیر اسلامی ہے اور مسلمانوں کو اسے رد کر دینا چاہیے تو یہ بات بھی انہیں اعلیٰ علمی سطح پر پیش کرنی اور دنیا پر ثابت کرنی ہوگی۔ مسلم اکیڈیمیا اور محققین کے لیے یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

iv- پچھلے دوسو سال میں مسلم معاشروں اور مغربی فکر وتہذیب کے علمبردار معاشروں میں گہرا تعامل وقوع پذیر ہوا ہے۔ پہلے ٹکراؤ پھر مغرب کا غلبہ پھر مسلم ممالک کی آزادی- ان ادوار میں مغرب نے پرامن ذرائع اور قوت وجبروت دونوں طریقوں سے مسلم معاشرے پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی ہے۔ اس باہمی تعامل کی وجہ سے مسلم معاشرے بے شمار مسائل سے دوچار ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں مغربی فکر وتہذیب کو قبول اور ردّ کرنے کی کئی سطحیں ہیں، کلی قبولیت اور مرعوبیت۔ محتاط اور محدود قبولیت۔ مکمل ردّ، محتاط استفادہ۔ ہر سطح کا اپنا استدلال اور اپنے مسائل ہیں جن کا مطالعہ ازبس ضروری ہے تاکہ مثبت سوچ بچار کے بعد موزوں نتائج اور حل تک پہنچا جاسکے۔

۲- اسلامی علوم کی تدوین نو

اللہ تعالیٰ نے جب یہ فیصلہ فرمادیا کہ حضرت محمد (ﷺ) اللہ کے آخری رسول ہیں اور اسلام کو تا قیامت باقی اور قابل عمل رہنا ہے تو اس نے کمال حکمت سے یہ اسکیم بنائی کہ وہ بنیادی امور جن کے ادراک میں انسانی عقل ٹھوکر کھا سکتی تھی اور جن کے بغیر انفرادی اور اجتماعی زندگی کو صحیح بنیادوں پر استوار نہیں کیا جاسکتا تھا، ان کے بارے میں نصوص نازل فرمادیں۔ تاہم اجتماعی امور یعنی معاملات کے وہ پہلو جو مستقبل میں تغیر کا تقاضا رکھتے تھے، ان کے بارے میں تفصیلی احکام دینے کی بجائے

پالیسی اصول دے دیئے اور یہ بات (امت کے) مجتہدین پر چھوڑ دی کہ وہ اس کی تفصیلات نصوص کی روشنی میں اپنی عقل و تجربے سے وضع کرتے رہیں۔ یہ چیز، جسے شرع میں اجتہاد کہا جاتا ہے، تقاضا کرتی ہے کہ معاملات کے اس غیر منصوص حصے پر ہر ملک و معاشرے میں اور ہر زمانے میں کام ہوتا رہے۔

مسلمان جب تک آزاد رہے یہ کام ہوتا رہا۔ قرون اخیرہ میں یہ کمزور ہوا اور دور غلامی میں استعمار نے اس کی گنجائش کم کر دی۔ اب جب کہ مسلمان ممالک آزاد ہو چکے ہیں اور مغربی فکر و تہذیب کا شکنجہ کچھ ڈھیلا ہوا ہے مسلمانوں کو چاہیے کہ معاملات میں مطلوب یہ اجتہادی کام زور شور سے شروع کریں تاکہ یہ مغربی تہذیب کے اصولوں اور اداروں کی جگہ لے سکے۔

علم اور تعلیم کے شعبے میں اس کی صورت یہ ہے کہ سارے عمرانی علوم جیسے سیاسیات، معاشیات، نفسیات، سماجیات، تعلیم، فلسفہ، تاریخ، قانون.....وغیرہ کو اسلامی اصولوں اور عصری ضرورتوں کے پیش نظر ان کی تدوین جدید اور تشکیل نو کی جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کا نصاب بھی از سر نو تشکیل دیا جائے اور ان کی درسی کتب بھی نئی تیار کی جائیں اور یہ کام اسی اجتہادی سپرٹ اور صورت میں کیا جائے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے تاکہ اس علمی کام کے نتیجے میں مسلم معاشرے اور ریاستیں اپنے اجتماعی معاملات عملاً ان کے مطابق چلا سکیں۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ علوم اسلامیہ کے محققین اپنے آپ کو قرآن، حدیث، فقہ جیسے روایتی اسلامی علوم تک محدود سمجھنا چھوڑ دیں اور عمرانی علوم کی اسلامی تشکیل نو کو بھی اپنے دائرۂ کار کا حصہ سمجھیں۔

۳۔ مسلم عروج و زوال

آج جب کہ ملتِ اسلامیہ مغرب کی غلامی کے چنگل سے نکل چکی ہے، تقدم اور از دہار کی خواہاں اور عظمت گم گشتہ کی متلاشی ہے، اس امر پر غور بہت ضروری ہے کہ صدر اوّل میں اس کی قوت و حشمت کا راز کس امر میں پوشیدہ تھا اور پھر اسے زوال کیوں آیا؟ ان دو سوالوں کا جواب اگر بحث و تحقیق کے بعد تفصیل سے دے دیا جائے تو اس وقت امت کے تقدم و از دہار کا لائحہ عمل تیار کرنا آسان ہو جائے گا۔ ہماری رائے میں یہ موضوع اتنا اہم ہے کہ اس پر عالم اسلام میں کئی ریسرچ سنٹر بننے چاہئیں اور اس پر بہت سے پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جانے چاہئیں۔

۶- اساتذہ کا کردار

سطور بالا میں ہم نے یونیورسٹی کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ میں تحقیق کی جس زبوں حالی کی

طرف اشارہ کیا ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے؟ خود احتسابی اور خود تنقیدی ایک مشکل کام ہے اور یہ جرأت و ہمت کا تقاضا کرتی ہے اور ہم جو علوم اسلامیہ کے پروفیسر یا صدور شعبہ ہیں (اور صدر شعبہ بھی بالعموم پروفیسر ہی ہوتا ہے) ہمیں اخلاقی جرأت سے کام لے کر یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہم ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ اور جب ہم ذمہ داری قبول کر لیں گے تو پھر ہی ہم اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں گے۔ ہمارے طلبہ کو اگر عربی و انگریزی نہیں آتی تو یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ان کی تدریس کا ہم انتظام کریں۔ اگر ریسرچ میتھاڈولوجی کا کورس غیر موثر ہے تو یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اسے موثر بنائیں اگر طلبہ Digital Sources سے ناواقف ہیں تو یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ انہیں ان سے مانوس کریں، ان کا تعارف انہیں کروائیں بلکہ انہیں ان میں طاق کریں۔ اگر طلبہ تحقیق کا کام مارے باندھے محض ڈگری حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں تو یہ ہمارا کام ہے کہ ان میں اس کا ذوق پیدا کریں تاکہ یہ ان کا شوق اور عادت بن جائے۔ اگر وہ روایتی اور پھسپھے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں تو ہم اساتذہ ہی اس کے ذمہ دار ہیں کیونکہ یہ ہم ہی ہیں جو ان موضوعات کو قبول کرتے ہیں۔ یہ ہم ہیں جو تھیسز کی نگرانی کا موثر اہتمام نہیں کرتے، طلبہ کو گائیڈ نہیں کرتے اور ان سے اچھی تحقیق نہیں کرواتے۔ بعض اوقات ہم تحائف بھی قبول کر لیتے ہیں اور سفارش بھی۔ یوں نااہل لوگ زیادہ محنت و مشقت کے بغیر آسانی سے ایم فل و پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر ایک استاذ نالائق بھی ہو تو پھر بھی اگر وہ چاہے تو اچھی ریسرچ کروا سکتا ہے کیونکہ ہم نے معاشرے میں دیکھا ہے کہ چور کبھی نہیں چاہتا کہ اس کا بیٹا چور ہو اور رشوت خور کبھی نہیں چاہتا کہ اس کا بیٹا رشوت خور ہو بلکہ وہ اپنی اولاد کو با اخلاق اور با کردار دیکھنا چاہتے ہیں لہٰذا اگر ایک استاد بعض لحاظ سے کمزور بھی ہو لیکن اگر وہ مخلص ہو تو اسے کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی کمزوریاں اس کے شاگردوں تک منتقل نہ ہوں بلکہ اس کے شاگرد لائق ہوں۔ لہٰذا ہم اساتذہ کو چاہیے کہ اپنا احتساب کریں اور اچھی تحقیق کروانے کی کوشش کریں۔

امید ہے کہ میری اس گفتگو سے اسلامی تحقیق کے کچھ پہلو واضح ہو گئے ہوں گے، طلبہ کو اچھی تحقیق کے تقاضوں سے کچھ آگاہی ہوئی ہوگی اور میں معذرت خواہ ہوں اساتذہ برادری سے اگر میں نے ان کی شان میں کچھ گستاخی کر دی ہو کہ اپنی کمزوریوں کا ادراک، نشان دہی اور ان پر قابو پانے کا عزم ہی کامیابی کی راہ ہموار کرتا ہے۔ و آخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین.

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین ☆

اسلامیات کی تدریس

کیسی ہو رہی ہے؟ کیسی ہونی چاہیے؟

اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ ایک مکمل نظامِ حیات ہے اور زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہر قسم کے حالات میں راہنمائی دیتا ہے۔ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے۔ اُٹھنے والے سماجی، سیاسی، معاشی، حیاتیاتی، طبعیاتی اور بین الاقوامی معاملات و مسائل کا جامع اور قابلِ عمل حل پیش کرتا ہے۔ حکمت اور تدبیر کی راہیں کھولتا ہے۔ تحقیق اور تفکر کا رجحان پیدا کرتا ہے۔ ندرت اور اختراع کے ذہنی آلات مہیا کرتا ہے۔ انسانی زندگی کو ہموار، آسان اور پُر مسرت بنانے کا سامان عطا کرتا ہے۔ ابلاغ کی مئوثر صلاحیتوں کی نشو ونما کے ساتھ جدو جہد میں ثابت قدم رہنے کی اہلیت پیدا کرتا ہے۔ عصری دنیا "علم پر مبنی معیشت" کی سطح پر اب پہنچنے کا دعوٰ ی کر رہی ہے جبکہ اسلام حیاتِ انسانی کے ہر شعبے، ہر سرگرمی اور ہر معاملے کو العلم کی اساس مہیا کرتا ہے۔ یہ ازل سے ہوتا آیا ہے اور اگر اہل ایمان عقل سے کام لیتے رہیں گے تو ابد تک ہوتا رہے گا۔

سطورِ بالا میں ہم نے اسلام کے متعلق جو کچھ کہا ہے کیا یہ محض دعوے ہیں، نعرے ہیں، خوش گمانیاں ہیں یا ان کی کوئی حقیقت بھی ہے؟ ہماری گزارش یہ ہے کہ یہ سب حقیقتیں ہیں جن کا شاید ہمیں ادارک نہ ہو کیونکہ اسلامیات کی تعلیم کی موجودہ صورتِ حال اور عصرِ حاضر کے مسلمانوں کا فہمِ اسلام ناقص، نامکمل اور جامعیت سے خالی ہے۔ اس وقت اسلامی علوم کی تعلیم دینی مدارس، جدید سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جارہی ہے۔ تمام مذکورہ اداروں میں اسلام کی جو تعلیم دی جارہی ہے اُس میں ایک طرف تو جامعیت کا فقدان ہے اور دوسری طرف بے ربط معلومات رٹا بازی کے ذریعے طالبعلم کے ذہن میں انڈیل دی جاتی ہیں جو وہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح ضرورت کے مطابق اُگل سکتا ہے۔ فہم، تجزیہ و تحلیل اور اطلاق، تدریس اسلامیات میں کہیں نظر نہیں آتا۔ پاکستان کے قدیم اور جدید طرز کے تعلیمی اداروں میں تعلیم کا عمومی معیار بہت گھٹیا ہے جب کہ اسلامی تعلیم کا معیار نہایت سطحی اور کمزور ہے۔ باوجود اس کے کہ مسلم سکالرز میں اس

☆ ماہر تعلیم، جوہر آباد (خوشاب) 0333-4404260

بات پر اتفاق رائے ہے کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے اور مکمل نظامِ حیات ہونے کی وجہ سے اسے زندگی کے تمام معاملات و مسائل میں راہنمائی کا فریضہ ادا کرنا چاہیے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس دعوے کے زبانی کلامی اظہار کے سوا دورِ حاضر کے مسلم سکالرز اور قائدین نے تفکر، تدبّر اور استخراج و اطلاق کے عمل کو کام میں لاتے ہوئے اجتہاد کر کے زندگی کے نئے اور پیچیدہ مسائل کو اسلامی تناظر میں حل کرنے کی کوئی کامیاب کوشش نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا اس کی کامل (Holistic) اور جامع (Comprehensive) حیثیت میں ہم مطالعہ و تدریس کا اہتمام نہیں کرتے۔ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے معلمانہ فرائض کا چار مختلف جگہوں پر ذکر ہوا ہے۔ چاروں مقامات پر آپ ﷺ کے معلمانہ فرائض کے چار پہلو بتائے گئے ہیں۔ پہلا تلاوت آیات، دوسرا تعلیم کتاب یعنی قرآن کا فہم، تیسرا تزکیہ نفس اور چوتھا تعلیم حکمت۔ ہماری رائے میں تعلیم حکمت تعلیم و تدریس کا وہ پہلو ہے جس کا تعلق معاملات و مسائل زندگی سے عہدہ برآ ہونے، ان کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے نظامِ حیات کے تحت کامیابی کے ساتھ گزارنے سے ہے۔ تعلیم حکمت کا ماخذ قرآن اور سنتِ نبوی ﷺ ہے۔ اس ضمن میں نصوص اور حدود اللہ کو چھوڑ کر باقی تمام معاملات میں زندگی کے پیچیدہ اور تغیر زمانہ کے ساتھ اُٹھنے والے نئے معاملات و مسائل میں استقراء، استخراج، اطلاق اور استنباط کی ضرورت ہے۔ یہ مہارتیں اور تدبّر و تفکر کے یہ زاویے اس وقت اسلام کی تعلیم و تدریس کا حصہ نہیں ہیں۔

ایک کمزوری یہ ہے کہ اس وقت اسلام کا علم مختلف اجزاء میں بٹے ہونے کی شکل میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ قرآن علیٰحدہ، حدیث علیٰحدہ، فقہ علیحدہ اور تاریخ اسلام بھی ایک علیحدہ شعبۂ علم کی حیثیت سے پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں۔ اس سے اسلامی تعلیمات کا ایک کلی اور جامع (Holistic and Comprehensive) وژن سامنے نہیں آتا۔ نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس شکل میں اسلامی تعلیمات شاید مذہب اور کلچر کا تصور تو سامنے لائیں لیکن اسلام ایک نظام حیات اور مستقبل پر نظر رکھنے والی تہذیب کا نقشہ پیش نہیں کرتا۔ ہماری ان معروضات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی تعلیم کے روایتی لوازمہ کو نظر انداز کر دیا جائے بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس لوازمہ کو حقیقت (Reality) سے علیٰحدہ کر کے نہ پڑھایا جائے بلکہ حقائق زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے اور ان کو زیر بحث لاتے ہوئے قرآن، حدیث، فقہ اور اسلامی تاریخ کی تدریس کی جائے۔ جدید دور کی ٹیکنالوجی کی معاونت کی وجہ سے اب ضروری نہیں رہا کہ کوئی طالب علم حافظے اور رٹے پر انحصار کر

ے اور اس طرح اپنی ذہنی توانائی ضائع کرے کیونکہ تمام قرآنی، احادیثی، فقہی اور تاریخی معلومات ایک بٹن کو دبانے سے میّسر آجاتی ہیں۔ اسلامی تعلیم و تدریس کا زور تجزیہ و تحلیل اور اطلاق پر ہونا چاہیے تاکہ طلبائے علم اور اسلامی سکالرز اسلامی نقطہ نگاہ (Islamic Paradigm) کے تحت غور و فکر کرتے ہوئے تمام عصری مسائل کا حل دریافت کریں اور اسلامی تعلیمات کو انسانی زندگی کے لیے بامقصد اور بامعنی بنائیں۔ تعلیم و تعلم کے مختلف النوع شعبوں کے درمیان تعلق اور تعامل نئے علم کی دریافت کے جدید طریقوں کا تقاضا ہے کہ ہم اسلامیات کی تعلیم و تدریس میں متحرک اور جان ماری پر مبنی اپروچ اختیار کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں وحدتِ علم کے تصور کی طرف مراجعت کرنا ہوگی جو درحقیقت قرون اولیٰ میں اسلامی تعلیم کا بنیادی نظریہ تھا۔

اسلامیات کی تعلیم کثیر شعبہ جاتی (Multi Disciplinary) اور بین شعبہ جاتی (Inter Disciplinary) تناظر میں دینا ضروری ہے۔ کثیر الجہتی اپروچ کسی موضوع کے مطالعہ کے لیے کئی شعبوں کے علم کو استعمال کرتی ہے مثلاً ریاستِ مدینہ کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر سوشل انتھراپالوجی (Social Anthropology)، پولیٹکل سائنس، انحصار باہمی (Cooperative Dependence) مختلف قومیتوں کے اتحاد پر مبنی تحفظ (Security) بین الگروہی اور بین الاقوامی تعلقات کے تصورات و آلات کو کام میں لا کر نتائج اخذ کیے جائیں، اصول وضع کیے جائیں اور پالیسیاں بنائی جائیں تو عمومی تصور سے کہیں بڑھ کر رہنمائی حاصل ہوگی۔ اسی طرح اگر ہجرت کا مطالعہ مسلمانوں اور کفارِ مکہ کے مابین کشمکش، مکہ کی اس وقت کی سیاسی، معاشرتی اور قبائلی صورتِ حال، مدینہ میں وہاں کے لوگوں کے تعلق کی وجہ سے اسلام کے پھلنے پھولنے کے امکانات، مدینہ کے لوگوں کی معاشرتی خصوصیات اور مدینہ کے تزویراتی وقوع کو سامنے رکھ کر رسول اللہ ﷺ کے پالیسی اقدامات کا تجزیہ کیا جائے تو ہماری آج کی دنیا اور اس میں پیش آمدہ مشکلات کے کئی متبادل حل سامنے آسکتے ہیں۔ اسلامی علوم کا ایک سکالر جسے کثیر الجہتی اور بین شعبہ جاتی اپروچ میں تربیت دی گئی ہو وہ دورِ حاضر کے پیچیدہ اور کثیر الجہتی (Multi Dimensional) مسائل اور مستقبل میں پیش آنے والے معاملات سے بہتر طور پر عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔

اسلامیات کی تعلیم اگر کثیر شعبہ جاتی (Multi Disciplinary) اور بین شعبہ جاتی (Inter Disciplinary) اپروچ کے لحاظ سے دینا ہے تو اسلام بطور مذہب، بطور ثقافت حتیٰ کہ بطور تہذیب نہیں پڑھایا جاسکتا۔ اس ضمن میں اسلام بطور ورلڈ ویو (World View) سامنے لانا ہوگا۔

ایک ورلڈ ویو کی حیثیت ہی سے اسلام ایک منفرد شعبہ علم کے طور پر اُبھارا جا سکتا ہے جو ہماری دنیا کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی، روحانی، سائنسی اور تکنیکی معاملات کے حوالے سے خصوصی اور استثنائی تناظر (Exceptionalizing Perspective) میں رہنمائی عطا کر سکتا ہے۔ ورلڈ ویو کی حیثیت ہی میں اسلام کسی بھی شعبہ علم کے طریقوں اور آلاتِ تحقیق کے لیے قابلِ مطالعہ ہو سکتا ہے کہ جس سے بنی نوع انسان کے مسائل کے سلسلے میں فہم میں وسعت آئے۔ مزید برآں ورلڈ ویو کی حیثیت سے ہی اسلام نہ صرف مسلمانوں کے لیے متعلقہ (Relevant) ثابت ہوگا بلکہ مغرب کے لیے بھی بامعنی اور بامقصد نظر آئے گا جو اپنے مسائل کے حل کے طور پر متبادل کے لیے بے چین ہے۔

کسی بھی نظام کے ورلڈ ویو (World View) کے بنیادی اجزاء تصورات (Concept) ہوتے ہیں۔ یہ تصورات ہی ہوتے ہیں جو کسی معاشرے، ثقافت اور تہذیب کو اس کی شناخت عطا کرتے ہیں۔ تصورات کا فریم ورک جس پر اسلام کے ورلڈ ویو کا انحصار ہے وہ اسلامی تہذیب کے لوازمہ اور معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور عملی مسائل حل کرنے کا طریقِ کار مہیا کرتا ہے۔ یہی وہ تصورات ہیں جو اسلامی معاشرے کو پالیسی گائیڈ لائینز مہیا کرتے ہیں اور اس کے اقدامات کو علمی توجیح فراہم کرتے ہیں۔ زمان و مکان کے کسی دور میں مسلم معاشروں کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ ان تصورات کے فہم اور انہیں روبہ عمل لانے کی نئی صورتِ حال اور نئے تقاضوں کی روشنی میں کتنی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی وہ تصورات ہیں جو اسلام کو آفاقی اور ابدی بناتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے وہ تصورات (Concept) کون سے ہیں جن کے متعلق سطورِ بالا میں ہم نے بات کی ہے۔ یہ تصورات قرآن و سنت سے اخذ ہوتے ہیں اور مثال کے طور پر چند ایک حسبِ ذیل ہیں: توحید، رسالت، عبادت، آخرت، خیر اور شر، عدل اور ظلم، استصلاح، استحسان، شوریٰ، جہاد، اجتہاد، محاسبہ، حسبہ، حدود، حکمت، حیا، تزکیہ، اخوت اُمہ، خلافہ.....وغیرہ۔

اسلام کا جو ورلڈ ویو ہے اُسے اگر ایک ملک تصور کیا جائے جس کا نقشہ بنانا مقصود ہو تو یہ قرآنی تصورات نقشے کا بنیادی ڈھانچہ مہیا کریں گے جبکہ آیاتِ قرانی، سیرتِ نبوی، شریعتِ اسلامی اور اسلامی تاریخ کے نظائر وہ بنیادی ٹولز (Tools) یا آلاتِ فہم مہیا کریں گے جو اس ملک کی نقشہ سازی کے لیے ضروری ہے مثلاً دین، مومن، اُمہ، خلافہ، شوریٰ، شریعہ، اطاعت، جہاد اور اموال کے تصورات پر غور کریں جو سیاست اسلامی کی بنیاد ہیں۔ طالب علم پہلے تو یہ دیکھے گا کہ قرآن مجید ان تصورات کے متعلق کیا کہتا ہے۔ اس کے بعد وہ دیکھے گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ ان تصورات کو

مدینہ کی ریاست میں کس طرح روبہ عمل لائے۔ پھر وہ یہ دیکھے گا کہ اسلامی علوم کے بعد کے ماہرین اور مجتہد حضرات نے ان تصورات پر کیا کلام کیا ہے اور بعد کے اسلامی معاشروں میں یہ تصورات کس طرح عمل پزیر ہوئے؟ آخر میں وہ یہ سیکھتا ہے کہ عصری علوم کے طریقہ ہائے کار اور آلاتِ مطالعہ سے ان اسلامی تصورات کے تازہ فہم اور عصری اطلاق کو کیسے ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ اس طرح طالبعلم قرآن کے بنیادی تصورات کا ادراک حاصل کر کے قرآنی علم پر عبور حاصل کرتا ہے۔ وہ سیرت کا مطالعہ اس حوالے سے کرتا ہے کہ ان بنیادی اسلامی تصورات نے سنتِ رسول اللہ ﷺ میں کیا رول حاصل کیا اور وہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ ایک زندہ تہذیب کے مظاہر کے طور پر کرتا ہے کہ کس طرح بنیادی اسلامی تصورات اسلامی معاشروں میں عمل پذیر ہوئے۔ کثیر الجہتی اور بین شعبہ جاتی مطالعہ اُسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ قرآن وسنت اور تاریخ اسلامی کے فہم وادراک سے اپنے زمانے کے معاملات ومسائل کو اسلام کے ورلڈ ویو کی روشنی میں حل کرے اور اس سلسلہ میں نہ صرف اُمہ کی بلکہ مغربی اقوام کی بھی راہنمائی کرے۔ اس طریق کار پر عمل کرتے ہوئے اُسے قرآنی تعلیمات زندگی کے قریب، سیرت کی تعلیمات زندگی سے مربوط اور اسلامی تاریخ ایک زندہ اور متحرک تہذیب کے طور پر نظر آئے گی۔

یہ ظاہر ہے کہ اسلامیات کے مطالعہ کی مذکورہ اپروچ تحقیق (Research) سے علیٰحدہ نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے اسلامی علوم وفنون میں مسلسل تحقیق کی ضرورت ہے جو اسلامیات کی تدریس وتعلیم کا لازمی حصہ ہوگی۔ اس طریق تعلیم میں تدریس یک طرفہ عمل نہیں ہوگا یہ معلم اور متعلم کے مابین سیکھنے کا دوطرفہ عمل ہوگا جہاں شاگرد استاد سے سیکھے گا وہاں استاد شاگرد سے بھی استفادہ کرے گا۔ کسی یونیورسٹی اور جامعہ اسلامیہ میں اسلامیات کا شعبہ ایک آزاد اور خودمختار ادارہ ہوگا جہاں تحقیق اور تدریس پہلو بہ پہلو ہوں گے۔

وطن عزیز کی پشاور، پنجاب اور کراچی کی جامعات میں شیخ زید اسلامک سنٹرز بنائے گئے۔ ہماری رائے میں ان شاندار اور دلکش اداروں کو اسلامیات کی تعلیم کے حوالے سے وہ کام کرنا چاہیے تھا جس کا ہم نے ایک اجمالی سا خاکہ پیش کیا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے ہاں اداروں میں جانفشانی سے کام نہیں کیا جاتا۔ دوسری طرف طلبا اور اساتذہ کی سیاست نے بھی جامعات میں علم اور تحقیق کو گہنا رکھا ہے۔ چاہیے تو یہ کہ اعلیٰ اسلامی تعلیم کے سب ادارے ہماری معروضات پر توجہ دیں اور اسلامیات کی تعلیم کو روایتی ڈگر سے ہٹا کر ایک متحرک اور مستقبل کی ضروریات کے مطابق ڈھالیں۔ کام کٹھن اور مشکل ہے لیکن ایک دفعہ آغاز ہو جائے تو توقع کی جاسکتی ہے کہ بریک تھرو ہوگا اور اسلامیات کا مطالعہ اور تعلیم ایسے افراد پیدا کر سکے گا جو اسلام کے ورلڈ ویو کے مطابق عصری مسائل اور مستقبل کے مسائل کا حل پیش کریں گے۔

مطالعۂ کتاب ڈاکٹر محمد امین

'اسلام اور جدیدیت کی کشمکش'

ازمحمد ظفر اقبال، کراچی

عصر حاضر میں اجتہاد اور غلبۂ دین کی معنویت

دائرۂ معارف اسلامیہ (جامعہ پنجاب) کی دس سالہ ادارت کے دوران ہمیں اس کی تربیت ملی کہ نہ کسی کی تعریف میں مبالغہ کرو اور نہ کسی کی مذمت میں لیکن ہم احتیاط کے ساتھ اور مبالغے سے بچنے کی شعوری کوشش کے باوجود خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتے ہیں کہ عرصے بعد 'اسلام اور جدیدیت کی کشمکش' کی صورت میں ایک عمدہ کتاب پڑھنے کو ملی۔ ہم اس کے فاضل اور نوجوان مصنف کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

قارئین ہمارے اس موقف سے آگاہ ہیں کہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے زوال کے دو بنیادی سبب ہیں: بنیادی اور داخلی سبب اپنے نظریۂ حیات سے عدم وابستگی ہے اور خارجی سبب مغربی فکر و تہذیب ہے۔ یہ فکر و تہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے۔ اس نے مسلمانوں کو لوٹا، کچلا، غلام بنایا اور اب بھی (برائے نام) آزادی ملنے کے باوجود مسلمانوں کی اکثریت فکری اور تہذیبی طور پر ان کی غلام ہے اور دنیا میں موجود ۵۷ مسلم ممالک کی سیاسی قیادت اب بھی عملاً مغرب کی غلامی کو قبول کرتی ہے اور اس قفس کی اتنی خوگر ہو چکی ہے کہ موقع ملے بھی تو اس سے نکلنے کو تیار نہیں۔ مسلم ادیبوں، صحافیوں اور دانشوروں کا حال بھی پتلا ہے۔ ان کی اکثریت آج بھی فکری و علمی طور پر مغربی فکر و تہذیب کی مزعومہ برتری سے مرعوب و متاثر ہے، اسے ہی ترقی کا واحد زینہ اور ماڈل سمجھتی ہے اور ان میں سے جو لوگ علوم دینیہ سے کچھ مَس رکھتے ہیں یا ان میں کچھ مہارت رکھتے ہیں ان کی انتہائے نگارش یہ ہوتی ہے کہ اسلام کو مغربی فکر و تہذیب کے مطابق ثابت کیا جائے اور 'فکری حریت'، 'عصری تقاضوں' اور 'اجتہاد' کے نام پر اسلامی تعلیمات کی کتر بیونت کر کے یا ان کی تعبیر نو کر کے انہیں مطابقِ مغربی فکر و تہذیب بنایا جائے اور عوام الناس کے سامنے اسے عین اسلام ثابت کیا جائے اور روایتی علماء کی بھد اڑائی جائے کہ وہ قدامت پرست، لکیر کے فقیر اور کٹھ ملا ہیں جنہیں کسی چیز کی سمجھ نہیں۔

ان حالات میں ان بالغ نظر اہل فکر ونظر کے سامنے جنہیں اللہ نے یہ توفیق دی ہے کہ وہ مغربی فکر وتہذیب کی تنگنائیوں سے اوپر اُٹھ کر سوچ سکیں، چیلنج یہ ہے کہ

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

اس چیلنج کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ومتاثر دانشوروں کی غلط فہمیوں اور مغالطوں کا توڑ کیا جائے اور صحیح اسلامی تناظر کے مقابلے میں ان کا بودا پن واضح کیا جائے۔ یہ وہ کام ہے جو ہمارے ممدوح محمد ظفر اقبال صاحب نے کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ انہوں نے بطور مثال دو جدید دانشوروں (ڈاکٹر منظور احمد اور نیاز فتح پوری) کے افکار کا محاکمہ کیا ہے اور ان کے موقف کی کمزوری کو صحیح اسلامی تناظر میں مبرہن کیا ہے اور ان کی غلط فہمیوں اور مغالطوں کے مسکت جواب دیے ہیں۔

ان کے کام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے کوئی بات بلاحوالہ نہیں کہی۔ انہیں نہ صرف عربی مراجع تک رسائی حاصل ہے بلکہ ان کا مغربی فکر ودانش کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور وہ بلاتکلف مغربی مفکرین اور فلسفیوں کے حوالے اور اقتباسات دیتے چلے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی ماضی کی عظیم الشان علمی روایت کو دیکھا جائے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں لگتی لیکن آج قحط الرجال کا یہ عالم ہے اور ہمتوں کی پستی کی یہ کیفیت ہے کہ ہمارے دینی مدارس کے علماء کرام اور یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ کے پروفیسروں میں ایسے لوگ خال خال ہی پائے جاتے ہیں جو ان دونوں زبانوں پہ دسترس رکھتے ہوں اور دونوں کے اساسی مراجع سے بلاتکلف فائدہ اُٹھا سکتے ہوں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ علوم اسلامیہ کے اساتذہ اور منتہی طلبہ کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے اور دینی مدارس اور یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ کی لائبریریوں میں یہ کتاب ضرور موجود ہونی چاہیے۔ جدیدیت سے متاثر اذہان کے لیے یہ کتاب تریاق ثابت ہوسکتی ہے بشرطیکہ وہ غیر جانبداری سے اس کا مطالعہ کریں۔

کتاب اور مصنف کی اتنی تعریف کے بعد اب مصنف کے لیے کچھ تجاویز تاکہ وہ ان پر غور کر سکیں اور اگر مناسب سمجھیں تو اگلے ایڈیشن میں کتاب پر نظر ثانی کے وقت انہیں پیش نظر رکھیں۔

۱- مصنف کی پہلی کتاب 'اسلام اور جدید سائنس- نئے تناظر میں' ڈاکٹر ذاکر نائیک کے

افکار کے محاکے پر مشتمل تھی اور موجودہ کتاب ڈاکٹر منظور احمد اور نیاز فتح پوری کے تنقیدی مطالعے پر مبنی ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ افکار زیر بحث آنے چاہئیں نہ کہ افراد۔ اور خصوصاً افراد پر ایسی تنقید جو ان کی ذاتی کمزوریوں کو بھی مبرہن کر دے، ذوق لطیف پر گراں گزرتی ہے۔ مصنف اگر افکار پر توجہ مرکوز کرتے اور جدیدیت کے علمبردار سب دانشوروں کی مثالیں قاری کے سامنے رکھتے تو شائد یہ کام زیادہ وقیع اور متوازن ہوتا۔

۲- مصنف نے دوران بحث بیسیوں نکات اٹھائے اور مباحث چھیڑے ہیں اور ہر ایک کے بارے میں دو تین صفحات لکھے ہیں۔ ان کا مطالعہ کرتے ہوئے شدید تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی بجائے اگر وہ کچھ متعین مباحث لیتے اور ان پر سیر حاصل بحث کرتے تا کہ متعلقہ موضوع کے سارے پہلو واضح ہو کر قاری کے سامنے آتے اور اس کے ذہنی اطمینان کا سبب بنتے، تو ہماری رائے میں یہ زیادہ بہتر ہوتا۔

اسی اپروچ کی وجہ سے کتاب ۵۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اگر چہ اصحاب علم و ذوق کے لیے یہ کوئی بڑی ضخامت نہیں لیکن بدقسمتی سے انٹرنیٹ، موبائل اور ایسے ہی دوسرے جدید ذرائع ابلاغ نے لوگوں کے ذوق مطالعہ کو بہت مجروح کیا ہے اور اب لوگ ضخیم اور ادق کتابوں سے جلد اکتانے لگتے ہیں لہٰذا آج کے مصنّفین کو یہ سوچنا ہوگا کہ وہ زبان سادہ اور سہل رکھیں اور کتاب کو زیادہ ضخیم ہونے سے بچائیں تا کہ قاری کے کتاب پڑھنے کے رجحان کی حوصلہ شکنی نہ ہو۔ اس کی بجائے یہ ہوسکتا ہے کہ متعین و محدود موضوعات پر دو تین سو صفحات کی کئی کتابیں مرتب کر دی جائیں۔

۳- مصنف کا نقطۂ نظر اکثر جگہ متوازن ہے اور ہمارے اور ان کے خیالات میں ہم آہنگی ہے تاہم کئی جگہ اپراہٹ (عربی میں غربت) کا بھی احساس ہوتا ہے..... یہ اختلاف رائے معمول کی بات ہے اور ممکن ہے ہمارا مطالعہ ہی ناقص و محدود ہو اور ہماری رائے غلط اور محتاج نظر ثانی ہو۔ اس طرح کے نکات میں سے ہم فی الحال صرف دو کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں: ایک اجتہاد اور دوسرے غلبۂ دین۔

مسئلہ اجتہاد

راقم کا مسلک اس ضمن میں جمہور سے الگ نہیں ہے اور نہ وہ مغربی فکر و تہذیب سے مرعوب

ہوکر اسلامی تعلیمات کو ان کے مطابق ڈھالنے کو کارِ اجتہاد سمجھتا ہے لیکن اس کے باوجود دو باتوں سے صرف نظر ممکن نہیں.....اور یہ بہت اہم ہیں:

ایک: یہ کہ ختم نبوت کے فیصلے کے بعد اسلام کے روز قیامت تک ہر زمان و مکان میں قابل عمل رہنے کی جو صورت شارع نے اپنائی وہ یہ تھی کہ اس نے عقائد، عبادات اخلاق اور معاملات کے بعض بنیادی پہلوؤں کے بارے میں تفصیلی اور نا قابل تغیر احکام دیے لیکن 'معاملات' کے بارے میں اس کی عمومی پالیسی یہ ہے کہ اس نے تفصیلی نظام نہیں دیا بلکہ پالیسی امور کے بارے میں رہنمائی فرمادی اور تفصیلات کا معاملہ امت کے مجتہدین پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے ماحول اور صرورت کے مطابق شرعی اجتہاد کے ذریعے اس کی تفصیلات وضع کر لیں۔ گویا شرعی اجتہاد کا تسلسل اور 'معاملات' کے حصے میں Fill in the blanks کا ایک بڑا کام ہر وقت ہوتے رہنا چاہیے.....ہمیں ڈر ہے کہ یہ کام مطلوبہ سطح کا عملاً نہیں ہو رہا۔

دوم: ہمیں پسند ہو یا ناپسند یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ مغربی فکر و تہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے اور اسی دنیا میں ہم مسلمان بھی رہتے ہیں۔ اس تہذیب نے خصوصاً سائنس و ٹیکنالوجی میں اس کی مہیب اور تیز رفتار ترقی نے انسانی تمدن کو بدل کر رکھ دیا ہے اور مسلمان معاشرے بھی اس سے متاثر ہو چکے ہیں۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ اجتہاد کا محولہ بالا کام اس تمدنی ترقی اور مسلم معاشرے کے اس کے ساتھ تعامل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے کیا جا سکے۔ اس کے لیے مغربی فکر و تہذیب کا گہرا مطالعہ اور اس کی تفہیم بھی ضروری ہے اور مسلم فرد اور معاشرے پر اس کے اثرات کا تجزیاتی اور ناقدانہ جائزہ لینا بھی ناگزیر ہے تاکہ اپنی روایت اور ماضی سے جڑے رہ کر عصری مسائل کا حل سامنے آ سکے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سارے عمرانی علوم کی تشکیل نو کی اور ان میں تخلیقی تحقیق کی ضرورت ہے مثلاً معاشیات، سیاسیات، ابلاغیات، نفسیات، قانون، سماجیات، اسلام اور فلسفہ.....وغیرہ۔ اس کام میں مغرب کی تقلید کی ضرورت نہیں لیکن ان علوم میں مغرب کی پیش رفت کو سامنے رکھنا بھی ناگزیر ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ یہ کام بھی مسلم معاشروں میں مطلوب کیفیت اور کمیت میں نہیں ہو رہا اور ہماری ناقص رائے میں یہ کام اس وقت تک ہو بھی نہیں سکتا، جب تک مغرب کو سمجھنے والے اور اجتہادی اہلیت اور سپرٹ رکھنے والے مسلم علماء و سکالرز میدان میں نہ آئیں۔

غلبۂ اسلام کا مسئلہ

ہم سمجھتے ہیں کہ لوگ اس مسئلے میں افراط وتفریط کا شکار ہو گئے ہیں۔ کچھ تو وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ دین کا اصل ہدف ہی غلبۂ دین، قیام نظام اسلامی اور اسلامی ریاست ہے تاکہ اقتدار دینی قوتوں کے ہاتھ میں آ جائے اور وہ ریاستی قوت سے اسلام کو معاشرے میں نافذ کر سکیں۔

دوسری طرف کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا ہدف صرف اصلاح فرد اور دعوت وتبلیغ وتزکیہ ہے اور ریاست کا قیام اور اقتدار کا حصول سرے سے کوئی دینی مطالبہ ہی نہیں۔

ہماری رائے میں یہ دونوں نقطۂ ہائے نظر افراط وتفریط پر مبنی ہیں اور صحیح اور متوازن نقطۂ نظر یہ ہے کہ:

☆ دین اصلاً فرد کو ہی مخاطب کرتا ہے۔ اس کی تعلیم اور تربیت (تزکیہ) ہی اس کے پیش نظر ہے تاکہ وہ دنیا میں اللہ کی عبادت واطاعت کی زندگی گزار سکے اور آخرت میں خوشنودئ رب سے متمتع ہو کر اس کی نعمتوں کا مستحق بن سکے۔

☆ لیکن افرادی زندگی میں دین پر چلنے اور اخروی کامیابی کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ فرد کو معاشرے اور ریاست کی تائید اور موافقت حاصل ہو کیونکہ ان کی مزاحمت اس کے بندگئ رب کے مطابق زندگی گزارنے کے نصب العین کو مشکلات کا شکار کر دیتی ہے لہٰذا انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں کا اسلام کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

☆ مشیت ایزدی اور نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد سے غلبۂ دین کے نتیجے میں جب مسلم معاشرہ اور ریاست قائم ہو گئے اور اللہ کی رحمت وفیضان سے ان کا تسلسل اب بھی جاری ہے تو جو کام آج مطلوب ہے، وہ اسلامی معاشرے اور ریاست کا از سر نو قیام اور انہیں عدم سے وجود میں لانا نہیں ہے بلکہ اسلامی معاشرہ بھی موجود ہے اور ریاست بھی (یا اسے جمع کی صورت میں کہہ لیں کہ اسلامی معاشرے بھی موجود ہیں اور اسلامی ریاستیں بھی) لیکن یہ اپنی مثالی اور معیاری صورت میں موجود نہیں ہیں لہٰذا اصل کام ان کی اصلاح کا ہے اور یہ کوئی حق وباطل کا معرکہ نہیں اور کفر و اسلام کی جنگ نہیں بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دعوت واصلاح کی نوعیت کا یہ مسلم معاشرے اور ریاست کی اصلاح کا کام ہے۔ اور اس کا منصوص طریقہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے

انبیائے کرام خصوصاً اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد (ﷺ) کو سکھایا اور جنہوں نے اس پر کامیابی سے عمل کر کے دکھایا یعنی تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ۔

☆ ہمیں ڈر ہے کہ آپ کا یہ کہنا کہ مسلمان مادی دوڑ کی مسابقت میں مغرب کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور یہ مسابقت مطلوب ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی سادگی اور دنیا طلبی سے گریز کی راہ پر پلٹ جانا چاہیے..... مسئلے کا حل نہیں ہے۔

ایک: تو اس وجہ سے کہ جس دین کا آغاز سادگی اور کس مپرسی سے فاران کی پہاڑیوں سے ہوا تھا اس کا نتیجہ بہرحال ایک فاتح اور بالادست ریاست، ایک شاندار تمدن اور عظیم تہذیب کی صورت میں نکلا تھا۔ کیا آپ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ ایک حادثہ تھا، جو ہوا غلط ہوا اور نہیں ہونا چاہیے تھا؟

دوسرے: آپ چاہیں نہ چاہیں اور بے شک اس کا انکار کریں لیکن آپ حالت مسابقت میں ہیں۔ ماضی میں آپ نے عالم کفر کو مغلوب کیا تھا۔ اب مغرب نے آپ کو مغلوب کر رکھا ہے۔ وہ آپ کو سر اُٹھا کر چلنے کی اجازت دینے کا روادار نہیں۔ عراق، لیبیا اور افغانستان کا کیا حشر کیا گیا اور شام اور پاکستان کا کیا کیا جا رہا ہے؟ آپ اسے تاریخ کا جبر کہہ لیجیے یا کچھ اور۔ بہرحال یہ صورت موجود ہے کہ آپ مغرب سے مغلوب رہیں گے یا اس پر غالب آئیں گے۔ درمیان کی کوئی راہ، آپ نے نہیں، خود مغرب نے آپ کے لیے نہیں چھوڑی..... اور اس میں بہرحال کفر بمقابلہ اسلام ہے۔ پہلے عیسائیت و یہودیت تھی اور اب مغرب کی الحادی فکر و تہذیب ہے۔

تیسرے: اگر آپ یہ کہتے تو شاید متوازن بات ہوتی کہ مسلمان اگر سادگی اور دنیا طلبی سے گریز کے اسوۂ حسنہ اور اسوۂ صحابہ پر عمل کریں گے تو وہ متقی مسلمان بن جائیں گے اور اس کا نتیجہ اعلاء کلمۃ اللہ کی صورت میں نکلے گا اور اس کے انعام میں انہیں دنیا میں بھی کامیابی (۱) اور غلبہ (۲) ملے گا اور آخرت میں بھی وہ فوز و فلاح سے ہم کنار ہوں گے۔

۱- رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً (البقرہ۲:۲۰۱)، وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْکُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِکُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ (ھود،۱۱:۵۲)، وَ لَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا وَ اَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْکَ (القصص۲۸:۷۷)، وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ..... (الانعام، ۶:۸۰)

۲- وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (آل عمران،۳:۱۳۹).....اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء ۲۱:۱۰۵)

اجتہاد اور غلبۂ دین کے حوالے سے ہم نے جو کچھ سطور بالا میں عرض کیا وہ ہماری رائے ہے اور غلط بھی ہوسکتی ہے۔ محمد ظفر اقبال صاحب چاہیں تو اس پر غور فرمائیں اور چاہیں تو اپنی رائے پر قائم رہیں۔ ہمارا مقصود ان کی رائے کا ابطال نہیں تھا تاہم وہ یا البرہان کے قارئین میں سے کوئی فاضل اگر تبادلۂ خیال کی خاطر اس موضوع پر لکھنا چاہیں تو البرہان کے صفحات حاضر ہیں۔

کراچی میں ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب اور سید خالد جامعی صاحب نے مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کے خلاف جو فکری حلقہ قائم کر رکھا ہے، اس کے سارے ہی ارکان پڑھے لکھے اور فاضل لوگ ہیں اور سب عمدہ کام کر رہے ہیں بلکہ قوم کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر جدید تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل ہیں۔ سید خالد جامعی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دینی علوم میں رسوخ بھی عطا فرمایا اور مغربی فکر و دانش پر دسترس بھی دی ہے لیکن ان کی قوت ابلاغ میں مشیت نے کسر رکھی (اور وہ ذات اپنے فیصلوں کی حکمت کو خود ہی بہتر جانتی ہے) لیکن محمد ظفر اقبال صاحب اس حلقۂ فکر میں ایک خوشگوار اضافہ ہیں جنہوں نے ایک دینی مدرسے سے تعلیم حاصل کی اور اب کراچی یونیورسٹی سے بھی استفادہ کر رہے ہیں اور تحریر کی عمدہ صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ان کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہیں۔

'اسلام اور جدیدیت کی کشمکش' لاہور میں کتاب سرائے اور دارالکتاب اردو بازار اور ادارہ پاکستان شناسی ۲۴/۲ سوڈھیوال کالونی ملتان روڈ سے اور کراچی میں فضلی سنز اردو بازار اور مکتبہ عمر فاروق ۴/۵۰۱ شاہ فیصل کالونی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

دوسرے شہروں کے احباب کتاب کے حصول کے لیے ادارہ علم و دانش پوسٹ بکس ۰۰۹۲۲۱ کراچی یا ای میل idarailmodanish@gmail.com پر رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

ہلال عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

کیونکہ

☆ ہم نے روزے رکھے، بھوک پیاس کاٹی لیکن تقویٰ حاصل نہیں کر سکے:

☆ عید مسلمانوں کی اجتماعی عبادت اور ان کی قوت و شوکت کی مظہر ہے..... جب کہ عملاً آج ہم قوت اور شوکت دونوں سے محروم ہیں۔

فھم دین

سید خالد جامعی ☆

متجد دین کا اسلوب دعوت اور طریق کار (۲)

۱۷-اسلام کی تباہی کا اصل سبب ملوکیت، تصوف، جامد مذہب اور سرمایہ داری تھے

یہ کہتے ہیں کہ: اسلام کی تباہی کا اصل سبب ملوکیت، تصوف، جامد مذہب اور سرمایہ داری تھے۔ حالانکہ سرمایہ داری اٹھارہویں صدی میں آئی ہے۔ یہ لوگ دولت اور سرمایہ کے فرق سے ناواقف ہیں۔ یہ ملوکیت، مشاورت، جمہوریت کے فرق سے بھی واقف نہیں، انہیں تصوف کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔

۱۸-اسلامی اصطلاحات کا استعمال

اسلامی جدیدیت پسند اپنی تحریروں میں اصطلاحات، علامات، شخصیات تو وہی استعمال کرتے ہیں جو اسلام میں مروج ہیں، لیکن ان کی ایسی توضیح تشریح توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ اصطلاح علامت اور شخصیت کا اصل مقصد کالعدم ہو جائے اور اصطلاح کا ہدف بھی حاصل نہ ہو۔ اس طرح دینی اصطلاحات کے دائرے میں رہتے ہوئے یہ تحریف دین کا کام کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام ظاہری مماثلتوں کے باوجود اسلامی اصطلاحات اسلامی شخصیات اسلامی تاریخ اسلامی علامات سے عمومی تنفر پیدا ہو جاتا ہے۔

۱۹-صرف قرآن

پروٹسٹنٹ ازم کی طرح یہ جدیدیت پسند قرآن کی طرف دعوت دیتے ہیں، صرف قرآن سے رجوع کرنے کا صور پھونکتے ہیں، قرآن کے لیے سنت کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

توحید کو رسالت محمدیؐ، سنت، احادیث، اسوۂ حسنہ سے الگ کر کے، علماء سے کاٹ کر، دین کی روایت اور تاریخ سے جدا کر کے دین کی من پسند تشریحات پیش کرنا آسان ہوتا ہے اور جس طرح مارٹن لوتھر نے پوپ کا اور علماء عیسائیت کا انکار کر کے ہر فرد کو عقل، منطق، اور استقراء کے ذریعے خود انجیل کو سمجھنے پر کھنے عمل کرنے کی دعوت دی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انجیل کی طرف دعوت

☆ ناظم تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی

کی تحریک آخر کار انجیل کو ترک کرنے کی دعوت بن گئی، گو کہ لوتھر کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا، اس نے پوپ کی حاکمیت رد کرنے کے لیے یہ طریقہ مناسب سمجھا۔ لہٰذا جو گروہ اور فرقے قرآن کی طرف بلاتے ہیں، ان کے یہاں عمل بالقرآن معطل ہو جاتا ہے، صرف قرآن پر تفکر تدبر و تحقیق باقی رہ جاتا ہے، باجماعت نماز کی بجائے نماز کے اوقات میں تدبر فی القرآن بغیر نماز پڑھے جاری رہتا ہے، آخر کار یہ رویہ بھی ختم ہو کر بے دینی پیدا ہوتی ہے اور دینی اقدار و روایات شخصیات علامات سے کامل نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۰۔تعقل قلبی کا انکار

جدیدیت پسند کانٹ کی طرح عقل محض کو تسلیم کرتے ہیں اور تعقل قلبی کے قائل نہیں، جبکہ اسلامی تاریخ میں تعقل قلبی نہایت اہم ذریعہ علم ہے۔ عقل محض کبھی حقیقت الحقائق اور اس کی معرفت کا ادراک نہیں کر سکتی، عقل کا مقام قلب ہے، تعقل قلبی پر اسلامی علمیت کے ہر مکتب فکر کی تحریریں موجود ہیں۔ تفسیر ماتریدی، ابنِ جوزی کی 'صید الخاطر'' قرطبی کی تفسیر قرطبی، ابن تیمیہؒ کے مجموع الفتاویٰ میں تصوف اور کتاب المنطق میں تعقل قلبی پر نفیس بحث ہے، امام قیمؒ کی کتاب الفوائد، شیخ الاسلام خلافت عثمانیہ علامہ مصطفیٰ صابری کی موقف العقل والعالم والعلماء، وغیرہ میں تعقل قلبی پر نفیس استدلال کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار فقہاء علماء کی کتابوں میں تعقل قلبی مرکزی مضمون ہے۔

۲۱۔تفردات اور شذوذ سے کلیات اخذ کرنا

جدیدیت پسند امت کی تاریخ پڑھ کر مختلف شخصیات کے تفردات علمی کو جمع کر لیتے ہیں اور ان تفردات سے نئی علمیت وضع کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ مسلمہ اسلامی روایت اور علمیت کے متبادل علمیت تخلیق کی جائے اور امت کی تاریخ، اجماع، روایت، تعامل اور تسلسل کو نظر انداز کر کے ہر شخص کو اجتہاد کامل کی آزادی دے دی جائے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جدیدیت پسند اجماع کو حجت نہیں مانتے لیکن کسی کے تفرد کو مان کر اسے حجت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ وہ تفرد کو حجت تسلیم کر رہے ہیں۔ جب اجماع حجت نہیں ہے تو تفرد کیسے حجت ہو سکتا ہے؟ اکثر جدیدیت پسند مسلم مفکرین کے تفردات کی دلیل یہی ہوتی ہے کہ ماضی میں فلاں فلاں ہستی اس رائے کی حامل رہی ہے، لہٰذا تمام تفردات جمع کر کے یہ فلسفے کی زبان میں

فلسفہ اصطفطائیت کے مکتب میں شامل ہوجاتے ہیں جو کم زور ترین فلسفہ تصور کیا جاتا ہے۔

۲۲- تخصیص وتعمیم

(ل) متجددین کا ایک حربہ یہ ہے کہ: رسالت مآب ﷺ کے اقوال اور صحابہؓ کے کسی خاص عمل، فیصلے، تعامل یا اجتہاد کی عصر حاضر میں تعمیم کرنا یا تخصیص کر دینا۔

مثلاً مشرکین اور یہود ونصاری کو جزیرۂ عرب سے نکالنے کا حکم اُس زمانے کے لیے خاص تھا، اُس عہد کے مشرکین واہل کتاب کے لیے تھا، وہ باقی نہیں رہے، لہٰذا حکم اب باقی نہیں، رسول کے ساتھ ختم ہوگیا، اِس میں قیامت تک توسیع ممکن نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قانون اتمام حجت کے تحت کفار واہل کتاب پر تلواروں کے ذریعے عذاب نازل کیا، مگر صحابہ نے روم وایران پر یہ عذاب کیوں نازل کیا؟ تو جواب ملے گا کہ رسول اللہ ﷺ انھیں خط لکھ چکے تھے، خط اتمام حجت تھا، لہٰذا صحابہ کا جہاد صرف اُس عہد کے لیے خاص تھا، اب نہ رسول ہیں نہ صحابہ، لہٰذا اِقدامی جہاد دین کی دعوت کے لیے قیامت تک ممنوع ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوسکتا تو متجددین کی طرف سے اس کی تصریح یوں کی جائے گی کہ کافر سے مراد عہد رسول کے کفار واہل کتاب و مشرکین تھے لیکن وہ باقی نہ رہے، لہٰذا یہ حکم بھی اب باقی نہیں ہے، اب کافر مسلمان ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں۔

(ب) کسی خاص اجتہاد کو اجتہاد کی بجائے تفرد قرار دینا اور اس اجتہاد کے تاریخی تناظر کو دانستہ نظر انداز کر کے اس کی تعمیم کرنا اور اس کا اطلاق عہد حاضر میں اس طرح کرنا کہ اسے مغربی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکے۔

مثلاً حضرت عمرؓ نے ایک عورت کو اسلام قبول کر لینے کے باوجود اپنے غیر مسلم شوہر کے ساتھ رہنے کی اجازت دی۔ اِس اجتہاد کی بنیاد پر مغرب میں آباد تمام ان عورتوں کو جو مسلمان ہوچکی ہیں اور اپنے شوہروں سے ترک تعلق چاہتی ہیں ان کا فر شوہروں کے ساتھ رہنے کی مکمل آزادی مہیا کرنا اور اس آزادی کے لیے شرعی دلائل دینا تاکہ متنوع معاشرے (Pluralistic Society) کی مغربی کافرانہ اصطلاح کے مطابق شریعت سے آزاد معاشرہ اور معاشرت تخلیق ومنظّم کی جاسکے۔ یہ اجتہاد کرتے ہوئے جدید بین اس بات کا ذکر نہیں کرتے کہ

اُس وقت خلافت راشدہ موجود تھی، خلافت راشدہ میں پبلک لاء اسلامی تھا، مسلمان دنیا کی امامت کررہے تھے، کفر کے بڑھنے پھلنے پھولنے کے کوئی امکانات نہ تھے، اہل کتاب جزیہ دے کر اور ذمی بن کر ریاست اسلامی میں رہ رہے تھے۔ کسی خاص صورت میں حضرت عمرؓ نے اِس کی اجازت دی جس پر کسی صحابی نے اعتراض نہیں کیا۔ اُس کے بعد اسلامی خلافت میں اِس اجتہاد کا کبھی اعادہ نہیں کیا گیا۔ اِس تمام تناظر، پس منظر، پیش منظر اور تہہ منظر کو دانستہ نظر انداز کرنا دراصل مغرب کو مطلوب اجتہاد کی دانستہ کوشش ہے۔

جدید یئین اجتہاد اور تفرد میں فرق کرنے سے قاصر ہیں، بہت سے معاملات میں ایک بڑا عالم اپنی رائے مختلف رکھتا ہے لیکن عمل اس رائے پر کرتا ہے جس پر امت کا اجماع ہو، علم وعمل کے اس فرق کو جدیدیت پسند دانستہ نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ حدیث کے کسی راوی کا عمل اگر اس کی روایت کے خلاف ہے تو راوی کا عمل حجت ہوتا ہے، اس کی روایت حجت نہیں ہوسکتی۔ مگر جدیدیت پسند راوی کے عمل کو نظر انداز کر کے روایت پر اصرار کریں گے۔

۲۳-تبدیلیٔ زمانہ کے ساتھ فہم قرآن کی تبدیلی

کہتے ہیں: زمانے کی بڑی تبدیلیوں کو سامنے رکھنا قرآن فہمی کے لیے ضروری ہے، یعنی فہم قرآن منحصر ہے تبدیلیٔ زمانہ پر، جیسے جیسے زمانہ بدلے گا قرآن کا فہم بھی سورج کی طرح اپنا رخ بدلتا جائے گا۔

۲۴-فقہ کے بعض اجماعی اصول قرآن وسنت کے منافی ہیں

کہتے ہیں: فقہ کے بہت سے اصول اور مسلمہ فیصلے جن کو اجماع کا درجہ حاصل ہے، قرآن وسنت کے منافی ہیں، جیسے مسلمان عورت کا کتابی مرد سے نکاح کا حرام ہونا قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہے، جب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی جھگڑے چل رہے تھے تب مسلمان عورت کی غیر مسلم مرد سے شادی فقہاء کی جانب سے ممنوع قرار دی گئی تھی، اب وہ جھگڑے ختم ہوگئے ہیں لہٰذا کفار سے نکاح جائز ہے۔

۲۵-رسول اللہ ﷺ کو قرآن کی کسی آیت کی تخصیص وتعمیم کا اختیار نہیں

جدیدیین کا نظریہ ہے کہ: رسول اللہ کو قرآن کی کسی آیت کی تخصیص وتعمیم کا اختیار نہیں،

کیوں کہ قرآن حجت اور قطعی الدلالۃ ہے، اسے کسی خارجی تشریح توضیح توجیہہ کی ضرورت نہیں، قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی نہیں ہے، خدا کا پیغمبر بھی اس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کرسکتا، کیونکہ اس کے الفاظ کی دلالت اس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہے، جو کہنا چاہتا ہے پوری قطعیت سے کہتا ہے، کسی معاملے میں اپنا مدعا بیان کرنے سے عاجز و قاصر و خاسر نہیں، اس کا مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ قبول کر لیتے ہیں، وہ نہ اس سے مختلف ہے نہ متبائن، اپنا مفہوم پوری قطعیت کے ساتھ واضح کرتا ہے، ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال اگر پیدا ہو جائے کہ اس کے الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر قطعی نہیں ہے تو قرآن کی ہر چیز بالکل بے معنی ہو جائے گی۔ قرآن کے مقامات ایسے ہیں جہاں ایک قول کے سوا کسی دوسرے قول کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی، القرآن لا یحتمل إلا تاویلا واحدا کہ قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کی ہرگز گنجائش نہیں ہوتی، قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے انسان مجبور ہے کہ بس وہ ایک ہی قول کو اختیار کرے ورنہ قرآن چیستاں بن کر رہ جائے گا۔ [میزان غامدی]

برعظیم پاک و ہند میں قرآن سے متعلق ان اصولوں کا اعلان احمد دین امرتسری، فراہی صاحب، پرویز صاحب، امین احسن اصلاحی صاحب اور جاوید غامدی صاحب نے کیا ہے، لیکن اس دعوے کے باوجود امرتسری صاحب اور پرویز صاحب نے قرآن کی ایک ہی آیت کے ایک سے زیادہ معانی بیان کیے ہیں، فراہی مکتب فکر کے تین اہم افراد فراہی صاحب، اصلاحی اور غامدی صاحب نے آیۃ حجاب سے متعلق آیات کے جو مفاہیم، معانی مطالب بیان کیے ہیں وہ بالکل متضاد ہیں۔ مکتب ایک، اصول ایک اور نتائج بالکل مختلف [تفصیلات کے لیے مجموعہ تفسیر فراہی، تدبر قرآن، مسلمان عورت دوراہے پر اور غامدی صاحب کی کتاب میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء میزان طبع دوم ۲۰۰۲ء، میزان طبع اول ۲۰۰۸ء، میزان طبع پنجم ۲۰۱۰ء میزان طبع ششم ۲۰۱۲ء، اسلام کیا ہے طبع اول تا طبع پنجم، اشراق کی فائلیں، قانون اور معاشرت پر ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۵ء تک شائع ہونے والے کتابچے، میزان ۲۰۰۸ء، ملاحظہ کیجیے]۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جناب غامدی صاحب نے ۳۵ سال کے عرصے میں آیۃ حجاب کے چھ (۶) سے زیادہ مطالب بیان کیے ہیں اور ہر نیا فہم سابقہ فہم کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ قرآن کے قانون میراث کی آیات کے غامدی صاحب نے ۱۹۸۵ء سے لے کر ۲۰۰۸ء تک تین مختلف مفہوم پیش کیے، جبکہ ان کے اصول کے مطابق بھی قرآن کی آیت کا ایک ہی

مطالب ہوسکتا ہے ورنہ قرآن چیستان بن جائے گا۔ [تفصیلات کے لیے میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء، میزان ۲۰۰۲، میزان ۲۰۰۸ء، مقامات طبع دوم جولائی ۲۰۰۶ء اور مقامات طبع اول نومبر ۲۰۰۸ء ملاحظہ کیجیے]۔

قرآن میں عورت کے نشوز پر مرد کو سزا دینے کی ہدایت دی گئی ہے (النساء:۳۴) اس آیت میں اجازت و ہدایت مرد کو دی گئی ہے اور قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے امت کا اجماع بھی یہی ہے۔ لیکن اہل قرآن کی طرح غامدی صاحب جو پیغمبر کو بھی قرآن کی کسی آیت کی تخصیص تعمیم یا ترمیم تفسیر و توضیح و تشریح کا اختیار نہیں دیتے خود اس آیت کی تعمیم و تخصیص و ترمیم و تصحیح کا اختیار اپنے لیے حاصل کر لیتے ہیں۔ میزان طبع اول ۲۰۰۸ء اور طبع پنجم ۲۰۱۰ء میں لکھتے ہیں:

''عورت کو جسمانی سزا دی جائے، ظاہر ہے یہ سزا اتنی ہی ہوسکتی ہے جتنی کوئی معلم اپنے زیر تربیت شاگردوں کو یا کوئی باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے، نبیؐ نے اس کی حد ''غیر مبرح'' کے الفاظ سے متعین فرمائی ہے، یعنی ایسی سزا نہ دی جائے جو کوئی پائیدار اثر چھوڑے، مرد کے تادیبی اختیارات کی یہ آخری حد ہے۔'' [ص:۴۲۱، ۴۲۲]

غامدی صاحب نے میزان ۲۰۱۰ء میں لکھا ہے کہ خدا کا پیغمبر بھی اس کے حکم کی تحدید و تخصیص اور ترمیم و تغیر نہیں کرسکتا (ص ۲۵، میزان ۲۰۱۰ء) لیکن یہاں پیغمبر کی تحدید و تخصیص خود بیان کر رہے ہیں جو ان کے طے کردہ اصول و مبادی کی نفی ہے، پیغمبر کو اپنے اصول کی نفی کی اجازت دینے کے بعد نفی کا یہ اختیار وہ اپنے لیے بھی حاصل کر لیتے ہیں اور قرآن کی اس ہدایت یا اجازت کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں، جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا خطرہ ہو انھیں نصیحت کرو، ان کے بستروں میں انہیں تنہا چھوڑ دو اور اس پر بھی نہ مانیں تو انہیں سزا دو، پھر اگر وہ اطاعت کریں تو ان پر الزام کی راہ نہ ڈھونڈو۔ [النساء:۳۴] جس میں تمام تر خطاب مرد سے ہے، خاندانی مسئلے سے ہے، نجی معاملہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ گھر میں حل کرنے کا طریقہ بتا رہے ہیں اور اسے عدالتوں میں گھسیٹنے اور عوامی گفتگو سے بچانے کے لیے اس کا ایک اندرونی حل پیش فرما رہے ہیں، مگر غامدی صاحب اس حکم کی تخصیص و توسیع و تعمیم و تشریح کرتے ہوئے اپنے اصول ارتقاء کے تحت عورت کو تادیب کے خدائی حکم کا ارتقاء کے تحت نیا مطلب بتاتے ہوئے مقامات طبع اول نومبر ۲۰۰۸ء میں لکھتے ہیں:

''تمدن کی تبدیلی سے عورت کو سزا کا حق عدالت کو دیا جاسکتا ہے، یہ محض طریقہ کار کی تبدیلی ہے، اِس سے کوئی حکم معطل نہیں ہوتا، سزا شوہر دے یا بزرگ دے یا عدالت دے، اس سے حکم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔'' [ص ۱۴۷، ۱۴۶]

قرآن نے صرف شوہر کو تادیب کرنے اور الزام تراشی سے بچنے کی ہدایت کی تھی، مگر غامدی صاحب نے پہلے میزان ۲۰۱۰ء میں تادیب کے حکم کو شاگرد اور اولاد کو سزا دینے کے عمل پر قیاس کر کے اس حکم کی تحدید و تخصیص کی کہ شوہر بیوی کو شاگرد سمجھے یا اولاد اور انہی پر قیاس کر کے بیوی کو سزا دے۔ جبکہ بیوی نہ شاگرد ہے نہ اولاد، کیونکہ شاگرد اور اولاد سے نہ نکاح ہوسکتا نہ طلاق دی جاسکتی ہے نہ ہم بستری ہوسکتی ہے۔ قرآن نے شوہر کو مخاطب کیا ہے، غامدی صاحب نے اس حکم کی تعمیم اور حکم میں توسیع کرتے ہوئے شوہر، خاندان کے بزرگ اور عدالت کے جج کو یکساں مرتبہ دے دیا۔ سرکش عورت کے لیے شوہر کے جو جذبات ہوں گے کیا وہی جذبات کسی بزرگ اور عدالت کے کسی جج کے ہوسکتے ہیں؟ بزرگ کی صحت اگر سزا دینے کے قابل نہ ہو تب؟ اگر وہ بہت کم زور بزرگ ہوں تب؟ عدالت مرد کی ہوگی یا عورت کی ہوگی؟ سزا جج دے گا یا اس کے لیے جلاد کا تقرر کرے گا؟ جلاد مرد ہوگا یا عورت ہوگی؟ اگر مرد ہوگا تو محرم ہوگا یا نامحرم ہوگا؟ اگر نامحرم ہوگا تو نامحرم عورت کو ہاتھ کیسے لگا سکتا ہے؟ اگر عورت جسمانی سزا دے گی تو عورت مرد کے مقابلے میں جسمانی طور پر کم زور ہوتی ہے اور عورت ذات ہونے کے باعث وہ سزا دے گی تو اس میں وہ جوش اور شدت بھی نہیں ہوگی جو شوہر میں ہوگی؟ تو کیا اس سے سزا کا مقصد حاصل ہو جائے گا؟ اگر عدالت کا مرد جج سزا دے گا تو وہ بھی عورت کو شرعاً اپنے ہاتھ سے سزا نہیں دے سکتا، آخری چارۂ کار یہ ہے کہ عدالت شوہر سے عورت کو اپنی نگرانی میں سزا دلوا دے، اگر یہی کرنا ہے تو غامدی صاحب کو اتنے اجتہادات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

سورۂ مائدہ میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم آیا ہے، مگر کون سا ہاتھ کاٹا جائے، اس کا حکم موجود نہیں ہے، مگر سنت / حدیث و اجماع کی روشنی میں دایاں ہاتھ پہنچے سے کاٹا جاتا ہے۔ غامدی صاحب کے اصول و مبادی کے تحت یہ غلط ہے، مگر خود غامدی صاحب اِسی غلط کی تقلید بھی کر لیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''قطع ید کی یہ سزا 'جزاء بما کسبا نکالا من اللہ' ہے۔ لہٰذا مجرم کو دوسروں کے لیے عبرت بنا دینے میں عمل اور پاداش عمل کی مناسبت جس طرح یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، اِسی طرح یہ تقاضا بھی کرتی ہے کہ اُس کا دایاں ہاتھ ہی کاٹا

جائے، اِس لیے کہ انسانوں میں آلۂ کسب کی حیثیت، اگر غور کیجیے تو اصلاً اِسی کو حاصل ہے۔'' [میزان: ۶۲۷]

۲۶-انتخابات، دعوت کا مؤثر ترین ذریعہ

متجد دین کہتے ہیں کہ: انتخابات دعوت دین کو بہت بڑے پیمانے پر لوگوں تک پہنچانے کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اگر انبیاء اس عہد میں مبعوث ہوتے تو وہ اِسی ذریعے سے اپنی قوت کا اندازہ لگاتے اور اِسی طریقے سے آئندہ کی حکمت عملی طے کرتے اور اسی طریقے سے انقلاب برپا کرتے۔

۲۷-روایتی اسلام پر عمل قدامت پرستی ہے:

روایتی اسلام کو جدیدیت پسند مفکرین Traditional Islam، Islamic، Evanegelism، Fundamental Islam، Orthodox Islam، Political Islam, Theocratic Islam, Revolutionary Islam قدامت پرستی، آبا پرستی، تقلید، دقیانوسی اسلام، وغیرہ کے ناموں سے پکارتے ہیں اور جدیدیت پسند اسلام کے لیے Moderate Islam، Real Islam، Folk Islam، Islamic Intellectualism، Revivalist Islam، New Islam، Islam in new Melinium، Liberal Islam، Open Democratic Islam، Popular Islam، Progressive Islam، Marksist Islam وغیرہ کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ (جاری ہے)

یارب

میں بچہ تھا تو جب اکثر کھلونے ٹوٹ جاتے تھے
مرے رونے پہ ماں آ کر کھلونے جوڑ دیتی تھی
سنا ہے ماں سے بھی بڑھ کر تجھے الفت ہے بندوں سے
تُو مجھ کو جوڑ دے یارب میں خود کو توڑ بیٹھا ہوں

(زاہد اقبال، اسلام آباد)

فهم دین

محترم علمائے کرام کے نام کھلا خط

السلام علیکم ورحمة اللہ! میں دین کے معاملے میں واجبی سا علم رکھنے والا ایک کمزور سا مسلمان، آپ سے جو اسلام کی روشنی کا مینار ہیں اور مسلمانوں کی رہنمائی اور تعلیم و تربیت کے مقامِ جلیلہ پر فائز ہیں، مخاطب ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ آپ مجھ ناچیز کی نسبت اس حقیقت سے زیادہ واقف ہیں کہ اسلام امن، محبت، یک جہتی اور اتحادِ انسانیت کا دین ہے۔ اسلام کی تمام فرض عبادات اجتماعیت کے خوبصورت رنگ سے مزین ہیں۔ اسلامی نظریۂ حیات کے تحت مسلم معاشرے کی تمام سماجی سرگرمیاں، اجتماعیت، اخوت اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہنے کی شان لیے ہوئے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ضد، انا، تعصب اور ڈیڑھ اینٹ کی علیحدہ مسجد بنانے کے شوق کی بنا پر فرقوں، گروہوں میں بٹنے کو سخت ناپسند فرمایا ہے اور مسلم امہ کو اتحاد اور اتفاق کی تلقین کی ہے۔ آپ کی خدمتِ اقدس میں میری ان معروضات کی وجہ دیگر دینی پہلوؤں کے علاوہ ماہِ رمضان میں اتحاد اور یک جہتی کا فقدان ہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ ایک عظیم اجتماعی شان کا مہینہ ہے۔ ایک ہی تاریخ سے شروع ہو کر ایک ہی تاریخ کو اختتام پذیر ہونا، ایک ہی وقت پر کھانا پینا بند کر کے ایک ہی وقت پر سب مسلمانوں کا کھانا پینا شروع کر دینا، تراویح کا اہتمام، صدقات و خیرات اور فطرانہ کے ذریعے معاشرے کے نادار طبقوں کی معاونت تاکہ مسلم امہ کے سب لوگ رمضان المبارک کی برکتوں سے فیض یاب اور عید کی خوشیوں سے سرشار ہوں۔ یہ سب باتیں میں نے محض اپنے اطمینان اور تذکیر کے لیے کہی ہیں ورنہ آپ حضرات ان امور سے زیادہ وسعت اور گہرائی کے ساتھ واقف ہیں اور ہم جیسے کم علم لوگوں کو ان باتوں کا شعور بھی دلاتے ہیں۔

میں نے سطورِ بالا میں ماہِ رمضان میں اتحاد اور یک جہتی کے فقدان کی بات کی ہے۔ میری اس سے مراد یہ ہے کہ سحر اور افطار کے وقت ہماری مساجد سے جو متفرق اعلانات ہوتے ہیں اس سے ماہِ رمضان کی روحِ اجتماعیت کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ فقہ جعفریہ اور فقہ حنفیہ کے ماننے والوں کے اوقاتِ سحر و افطار میں اختلاف تو بھاری دل کے ساتھ کسی حد تک برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن شیعہ حضرات کے علاوہ باقی مسلمانوں کی مساجد سے اوقاتِ سحر و افطار میں پانچ پانچ، دس، دس منٹوں کا فرق کسی طرح مستحسن نہیں ہے۔ خصوصاً سحری کے وقت عجیب تماشا برپا ہوتا ہے۔ ہمارے مقتدر علماءِ کرام نے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کرنے کے لیے کوئی نوآموز اور شوقین شاگرد بٹھا

رکھا ہوتا ہے۔ایک مسجد سے اعلان ہوتا ہے کہ "سحری کا وقت ختم ہونے میں پندرہ منٹ باقی ہیں جلدی جلدی کھا پی لو"اس اعلان کے ختم ہونے کے بعد دوسری مسجد سے جو قریب ہی ہوتی ہے اعلان ہوتا ہے "سحری کا وقت ختم ہونے میں بیس منٹ باقی ہیں جلدی جلدی کھا پی لو" کچھ دیر کے بعد ایک اور مسجد سے اعلان ہوتا ہے "سحری کا وقت ختم ہو چکا ہے، کھانا پینا بند کر دو"اور فوراً ہی ایک اور مسجد سے لاؤڈ سپیکر کے فل والیوم کے ساتھ اعلان ہوتا ہے "سحری کا وقت ختم ہونے میں ابھی پانچ منٹ باقی ہیں جلدی جلدی کھا پی لو" سحری کے وقت عجیب تماشا لگا ہوتا ہے اور ہر مسجد سے اپنا اپنا وقت نشر کرنے کا مقابلہ جاری رہتا ہے۔ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ ہم نے رمضان المبارک کی سحری کو بازیچہ اطفال بنا دیا ہے۔اگر کوئی شخص سحری کے وقت اُٹھ کر نوافل پڑھنا چاہے تو لاؤڈ سپیکروں میں اعلانات کا میچ عبادت میں یک سوئی اور حلاوت کا مزہ ہی کرکرا کر دیتا ہے۔ اب اس جدید دور میں جب کہ سحر وافطار کے چارٹ شائع ہو کر ہر گھر میں موجود ہوتے ہیں نیز ہر گھر میں ہی نہیں ہر شخص کی جیب میں موبائل فون کی شکل میں وقت دیکھنے اور معلوم کرنے کی سہولت موجود ہے تو ہر پانچ دس منٹ کے وقفے سے ہر مسجد سے سحری کے ختم ہونے کے وقت کے اعلان کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر محترم علماءِ کرام اِسے ضروری خیال کرتے ہیں تو اوقاتِ سحر و افطار پر باہمی اتفاق کر کے کسی علاقے کی کسی ایک مسجد سے باری باری یہ شوق پورا کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ ویسے قرآن حکیم میں تو یہ کہیں نہیں لکھا اور نہ ہی کسی حدیث مبارکہ میں وارد ہوا ہے کہ سحری کتنے منٹ اور کتنے سکینڈ پر بند ہوگی یا افطار کتنے منٹ اور کتنے سکینڈ پر وقوع پذیر ہوگی۔قرآن حکیم میں تو افطار غروب آفتاب کے ساتھ مشروط ہے اور سحری کا اختتام کا تعلق سپیدہ سحر کی وہ کیفیت ہے جس میں سفید اور کالے دھاگے میں امتیاز کیا جا سکے۔اس سلسلہ میں اگر اجتہاد کر کے اوقاتِ سحر و افطار کے چارٹ بنا لیے گئے ہیں تو کیا وہ کافی نہیں ہیں؟ لاؤڈ سپیکروں پر اسلامی یک جہتی کو پارہ پارہ کرنا اور بلاوجہ مسلمانوں کی اجتماعیت کی شان کو خراب کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔

محترم علماءِ کرام اس بے علم ناچیز سے زیادہ اس امر سے واقف ہیں کہ نمایاں ہونے کی خاطر،ضد،انا اور تعصب کی وجہ سے مسلمانوں میں گروہ بندی،تفرقہ بازی اور دوریاں پیدا کرنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک کتنا بڑا جرم اور گناہ ہے۔اس ناچیز نے محض یاد دہانی کی خاطر یہ معروضات آپ کی خدمت میں پیش کی ہیں،اگر کہیں گستاخی یا اہانت کا کوئی پہلو نکلتا ہو تو معافی کا خواستگار ہوں۔

خاکپائے علماءِ حق

(پروفیسر ملک محمد حسین)
سیٹلائیٹ ٹاؤن۔جوہر آباد

ڈاکٹر علی شریعتی. ڈائیلاگ

محمد عمران خان☆

ڈاکٹر علی شریعتی کے افکار کا تقابلی جائزہ

ہم نے ڈاکٹر علی شریعتی پر جو لکھا تھا، اس کے بارے میں ہمیں دو تحریریں موصول ہوئی ہیں: ایک ہمارے موقف کے حق میں اور دوسری اس کے خلاف۔ ہم دونوں دے رہے ہیں تا کہ قارئین کو تقابلی مطالعے کا موقع ملے۔ مدیر

اسلامی نشاۃِ ثانیہ یا اصلاح احوال کی کوششیں کیسے کی جائیں؟ یہ بے حد متنازعہ سوال رہا ہے۔ نشاۃِ ثانیہ کے اولین علمبردار امام غزالی نے اپنی تصنیف احیاء العلوم میں تحریک احیاء کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے بڑی وضاحت سے اظہار خیال کیا ہے۔ غزالی نشاۃِ ثانیہ کے دو مرحلے تجویز کرتے ہیں۔ وہ پہلے مرحلے میں عوام الناس میں دین کا شعور پیدا کرنے پر زور دیتے ہیں اور دوسرے مرحلے میں سیاسی اصلاحات نافذ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ابتدائی مرحلہ کی تکمیل کے بغیر دوسرے مرحلے میں قدم رکھنے کو خطرناک قرار دیتے ہیں جبکہ اس کے برعکس جدید دور کے احیائے اسلام کے مفکرین رائے عامہ کی بیداری کو انقلاب کی کامیابی کی اولیں شرط قرار دیتے ہیں اور جب ممکن ہو زور بازو سے سیاسی قوت کا حصول درست سمجھتے ہیں۔ احیائے اسلام کے تمام علمبردار انسانوں کے مابین اسی اخوت، اسی ہمدردی و موانست اور اسی سماجی انصاف کا دور دورہ دیکھنا چاہتے ہیں جو عہد نبوی ﷺ میں مدینہ منورہ میں تھا۔ ایسے مثالی دور کی واپسی کی خواہش اسی صورت میں بامعنی ہوسکتی ہے جب حکمران قرون اولیٰ کے حاکموں کی طرح تقویٰ و پرہیز گاری کے راستے پر گامزن ہوں۔ اس دور کو واپس لانے کے لئے ان حضرات کے سامنے بے شمار چیلنجز تھے مثلاً انھیں اسلام کی تعلیمات کا تجزیہ کرنا پڑا اور ان میں سے اس دور کے مجبور اور لاچار انسان کی ضرورتوں کا حل پیش کرنا پڑا۔ نیز روحانیت و مادیت کے درمیان دوری اور تفاوت کا جو تصور رائج ہے اس کو نہ صرف مٹانا بلکہ ان میں توافق و توازن بھی پیدا کرنا چاہا۔ اس کاروائی اور عمل میں انہیں بعض انوکھی اختراعات بھی کرنا پڑی ہیں۔ اس تعمیری عمل میں انہیں کچھ مسالہ اپنی طرف سے لگانا پڑا اور کچھ موجودہ مسالہ ترک بھی کرنا پڑ گیا۔

☆ کراچی Imrann2010@gmail.com

ان حضرات کے نزدیک جدید تہذیب نے دو قسم کے اثرات چھوڑے: اچھے اور دلکش اثرات جنھیں قبول کیا جاسکتا ہے اور برے اثرات جن سے بچنا بہت ضروری ہے یعنی (۱) جدید تہذیب ''انسانی عقل'' کو حق وصداقت تک پہنچنے کا واحد راستہ قرار دیتی ہے اور آسمانی ہدایت کو بالکل ترک کر دینے کی تلقین کرتی ہے یہ بات مسلمانوں کے لئے بالکل ناقابل قبول ہے کیونکہ جتنی سماجی اور اخلاقی برائیاں اس وقت موجود ہیں وہ اسی سوچ کا نتیجہ ہیں (۲) اس تہذیب کا دوسرا پہلو علوم وفنون کی ترقی اور مظاہر قوت کی تسخیر کی کاوشیں ہیں جو انسانی زندگی کو آسان (پرتعیش) بناتی ہیں یہ پہلو مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہے۔ گویا انہیں یہ اصول بیان کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ پیش نہیں آتی کہ ''قاتل کا سر اڑا دو لیکن اس کے ماہرانہ ہاتھوں اور انگلیوں کو بچالو تاکہ ان سے سائنس وٹکنالوجی کے فروغ کا کام لیا جاسکے۔''

علی شریعتی ایران کے ایک قدیم پیشہ ور خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے دادا اخوند حکیم کے نام سے مشہور اور صوبہ خراسان کے قصبہ مزینان میں خطیب و امام تھے۔ جبکہ والد محمد تقی مزینانی نے مشہد کی مشہور درسگاہ سے ثانوی درجہ کے بعد تعلیمی سلسلہ ترک کر دیا اور شعبۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مستقبل کا ذمہ دار شہری بننے کے لئے نوجوانوں کو ایسی مذہبی تعلیم حاصل کرنی چاہیے جو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ انھوں نے دو پرانی خاندانی روایات توڑیں: اول تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنے کے بعد وہ اپنے آبائی علاقے مزینان نہیں گئے۔ دوم علماء کا مخصوص لباس ترک کر کے ہیٹ پہننا شروع کر دیا۔

علی شریعتی (24 نومبر 1933 تا 19 جون 1977ء) محمد تقی اور زہرہ بی بی کے پہلے بیٹے تھے۔ وہ باپ کے پاس خصوصاً رات کا زیادہ وقت گزارتے۔ مطالعہ زیادہ تر دو ہزار کتابوں پر مشتمل گھریلو لائبریری میں کیا کرتے۔ شریعتی کے بقول ان کی روحانی تربیت میں ان کے والد کا کردار بنیادی رہا، جنھوں نے بیٹے کو مراقبہ اور انسان بننے کے قواعد اور ان کی تکنیک سے آگاہ کیا۔ نوجوان شریعتی نے 50-1946ء تک ماریس، میٹرلنک، شوپنہار، فرانز کافکا اور صادق ہدایت کی اہم تصانیف کا مطالعہ کر لیا تھا، ان کے اپنے اعتراف کے مطابق: ''اس لٹریچر نے میرے مذہبی عقائد کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں، اور وجود باری تعالیٰ کے بارے میں بھی شکوک وشبہات پیدا ہوگئے (اسلامی نشاۃِ ثانیہ کے معمار از علی رہنما، مترجم محمد یحییٰ خان، ص: 241)

مغربی فلسفوں نے ان کی پریشان فکری اور ذہنی الجھاؤ میں اتنی شدت پیدا کردی کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا تھا، یہاں تک کہ انھوں نے خودکشی کا مصمم ارادہ بھی کرلیا تاہم اس کی نوبت نہ آسکی۔اسی اثناء میں مشرقی فلسفہ کی روحانیت اور مثنوی مولانا روم میں کچھ طمانیت محسوس ہوئی۔حضرت ابوذر غفاریؓ کے کردار کے مطالعہ سے وہ بہت متاثر ہوئے اور اس یقین کا اظہار بھی کیا کہ سماجی انصاف، مساوات، حریت اور سوشلزم کے جو تصورات مغربی دانشوروں کے ذریعے ایران پہنچے وہ دراصل اسلامی ورثہ کے اجزائے لاینفک ہیں۔اپریل 1959ء میں وہ اسکالرشپ پر پیرس (فرانس) گئے جہاں ایک طرف وہ اس کی سماجی برائیوں اور اخلاقی انحطاط سے اظہار نفرت کرتے ہیں تو دوسری جانب ان کے سماجی شعور اور ذہانت کے کمالات کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔انھوں نے مسلمہ روایات (شیعی) سے انحراف کرتے ہوئے لکھا''میں وہ دن دیکھنے کی دعا کرتا ہوں جب ایران میں مذہبی آگاہی اور شعور اس درجے پر پہنچ جائے کہ سرکاری شیعیت کا ترجمان حضرت فاطمہؓ کو اس روپ میں پیش کرے جس کا ذکر مسیحی دانشور سلیمان قطانی نے کیا ہے، حضرت علیؓ کو اس روپ میں پیش کیا جائے جو مسیحی ڈاکٹر جارج جوردک George Jordaq نے بیان کیا ہے، اہل بیت کا ذکر اس طرح کیا جائے جیسے ماسینون Massignan (کیتھولک ماہر اسلامیات) نے اپنی ریسرچ میں کیا ہے، اور حضرت ابوذرؓ کو جودت السحر کی آنکھ سے دیکھا جائے۔قرآن کا وہ ترجمہ گوارا کرلیا جائے جو Regan Blacher نے کیا ہے۔انہوں نے ''مزید؛لکھا''ان (ماسینون) کی سحر انگیز شخصیت نے میرے اندر کی کایا پلٹ دی''۔لوئی ماسینون کا دریافت ہوجانا گویا ان کے لئے مولانا روم کا مغربی نعم البدل تھا۔مستشرق لوئی ماسینون (1883-1962ء) کی پسندیدہ شخصیت حسین بن منصور حلاج تھا جس پر ماسینون نے متواتر 55 برس کام کیا۔یادرہے منصور حلاج انسان میں اللہ تعالیٰ کے حلول (یہ شیعی عقیدہ بھی ہے) اور وحدت الوجود (کائنات میں صرف خدا کا وجود ہے اور کچھ نہیں) کے قائل تھے۔حلاج کا شعر ہے:
ہم دو روحیں ہیں جنھوں نے ایک صورت بنالی ہے''انا الحق (میں خدا ہوں) کا نعرہ اکثر لگایا کرتے تھے جس کی پاداش میں 309ھ میں آپ کو سزائے موت دے دی گئی۔علی شریعتی کے روحانی پیر مولانا روم (م 1273ء) کا دلچسپ موضوع یہی وحدت الوجود اور اس کی فلسفیانہ و صوفیانہ تفسیر وتعبیر تھی:

ہر کہ از ہستی ٔ خود مقصود شد
منتہائے کار او محمود شد

گفت فرعونی انالحق گشت پست
گفت منصوری انا الحق و برست

آں انا رالعنۃ اللہ در عقب
دین انا را رحمۃ اللہ اے محبّ

(ترجمہ: فرعون انا الحق کہہ کر منکر خدا ہوا، جس کے نتیجہ میں اسے پستی ملی اور منصور حلاج نے اپنی ذات کا انکار کر کے اس میں خدا کی تجلیات کا مشاہدہ کیا لہٰذا وہ نجات پا گیا)۔

ماسینون کے حلاج میں اس قدر دلچسپی کی وجہ کا ذکر اس نے اپنے معروف مقالہ ''قوس زندگی حسین بن منصور حلاج'' (فارسی: ڈاکٹر عبدالغفور روان فرمادی، اردو: پروفیسر صابر آفاقی) کے قائم کردہ آخری باب ''حلاج و مسیح'' کے اس جملہ میں کیا: ''منصور حلاج کی زندگی کا محاکمہ اور شہادت حضرت مسیح کی شہادت سے بڑی مشابہت رکھتی ہے''۔ گویا وہ مسلم روایت (صوفی) میں بھی سیدنا عیسیٰؑ کی سی الوہی صفات کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ یاد رہے یہود و نصاریٰ نے حضرت عزیرؑ و عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا (یا خدا) بنالیا تھا (توبہ 30:9) نیز ہندو عقیدہ اوتار اس سے مشابہ ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی (ڈائریکٹر جنرل دعوۃ کیڈمی، اسلام آباد) لکھتے ہیں: انسان کی متوازن شخصیت اور معتدل سرگرمیوں کا انحصار اس تعین پر ہے کہ خدا کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے اور اس سے بھی پہلے جاننا چاہیے کہ اس کا تصور خدا کیا ہے؟ پروفیسر ڈاکٹر محمود غزنوی (چیئرمین ماس کمیونیکیشن، کراچی یونیورسٹی) کہتے ہیں: تصور خدا سے ہی قوموں اور تہذیبوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ ماسینون کے بعد شریعتی ماہر سماجیات George Gurvitch کے گرویدہ ہو گئے، جو کہ سٹالن اور فاشزم کا ہمنوا رہ چکا تھا۔ اس کے لائف اسٹائل اور سماجی نظریات نے شریعتی کو بہت متاثر کیا، یہ گویا مغربی ابوذر (غفاری) ڈھونڈ نکالا گیا تھا۔ جیکس برک کی کلاسوں سے شریعتی نے مذہب کے سماجی پہلو کے بارے میں آگاہی حاصل کی۔ مارکسٹ فرانز فنان Frantz Fanon (1925-1961ء) سے تیسری دنیا کی یکجہتی اور بین الاقوامیت (globalization) کا درس لیا، وجودی ژاں پال سارتر (1905-1980ء) سے انسانی

آزادی کا اصول اور ہر قسم کے جبر کے خلاف بغاوت کے سلسلہ میں فرد کی ذمہ داری کا سبق سیکھا۔ فرانسیسی ماہر حیاتیات Alexis Carrel (1873-1944ء) سے سائنس اور عقیدہ میں ہم آہنگی کے تجربات سنے اور اس کی کتاب ''دعائیں'' کا فارسی ترجمہ کروایا۔

علی شریعتی کی فکر کی چند جھلکیاں اور ان کا تجزیہ

ڈاکٹر علی شریعتی کے بقول: مذہب اور عقل ایک ہی حقیقت ہیں ((یہ بات معلوم رہنی چاہیے کہ فقہ جعفری (اثناء عشری) میں استنباط احکام کے چار مصادرِ تشریع میں سے آخری ''عقل'' ہے جس میں قیاس شامل نہیں ہوتا (اہل سنت کے ہاں قیاس ہے)۔ لہذا نص کی عدم موجودگی میں عقل کے ذریعہ ماخوذ حکم ہی شارع کا حکم ہوتا ہے کیوں کہ یہ شارع یا امام معصوم کے حکم ہی کو ظاہر کرتا ہے (علامہ محمد ظاہر مظفر، اصول افقہ 122/2)۔ علی شریعتی چونکہ روایتی عالم دین نہ تھے بلکہ مغربی فکر و فلسفہ سے انھوں نے عقل کی بالادستی کا تصور لیا۔ تاہم قوی امکان ہے کہ ایک مذہبی خانوادے اور خاندانی لائبریری سے استفادے کی وجہ سے انھیں شیعی اصولیین کے اس مصدر کا سیر حاصل علم ہوگا لہذا مغربی فلسفہ وجدیدیت کی جانب مرعوبانہ جھکاؤ میں اس مذہبی مصدر ''عقل'' نے تقویت ضرور فراہم کی ہوگی۔ اہل السنۃ کے بالمقابل اہل التشیع میں عقل واستدلال کے استعمال کے حوالہ سے ڈاکٹر حسین نصر کا بیان ملاحظہ ہو۔ انکے بقول ڈارون کا نظریہ ارتقاء (Evolution) اسلامی نقطہ نگاہ سے قابل قبول ہے اور اسلام جمہوریت پر مبنی ہے۔ انہوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ انسان میں تین اوصاف پائے جاتے ہیں: ۱-شعور ذات ۲-چوائس یعنی انتخاب واختیار کی صلاحیت ۳-تخلیق کی قوت۔ مکمل آزادی، آگہی اور سیاسی پختگی کے لئے علی شریعتی، لینن کے تصور ''اخلاقی قیادت'' کے وفادار رہے نیز ان کے خیال میں انسان کو مساوات اور سماجی انصاف صرف سوشلزم میں ہی مل سکتا ہے۔ شریعتی کے نزدیک ایک مثالی معاشرہ وہ ہوگا جس کا اقتصادی نظام سوشلسٹ ہو اور اخلاقی نظام اسلام کی روحانی قدروں اور ایمان باللہ پر مبنی ہو۔ (یاد رہے ذوالفقار علی بھٹو (1928-1979ء) کی پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور کا خلاصہ تھا: اسلام ہمارا دین ہے؛ سوشلزم ہماری معیشت ہے؛ جمہوریت ہماری سیاست ہے؛ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں)۔

1۔ علی شریعتی کا فہم اسلام مستشرقین سے ماخوذ؛ مستشرقین محققین کی نظر میں:

علی شریعتی کی مختصر سوانح سے بخوبی اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ مستشرقین (Orientalists)

یعنی علوم اسلامیہ وشرقیہ کے مغربی ماہرین) سے بہت متاثر تھے اور اسلام کو ان کے علم و تناظر سے ہی سمجھا اور سمجھایا کرتے تھے مثلاً علی شریعتی نے لکھا''ان (لوئی ماسینون) کی سحر انگیز شخصیت نے میرے اندر کی کایا پلٹ دی''۔محققین اسلام کی مستشرقین کے بارے میں کیا تحقیق ہے؟ ملاحظہ کیجئے:

(۱)ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی کتاب''المستشرقون والاسلام'' کے ضمیمہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:''اس استشراق کی تاریخ بہت پرانی ہے جو واضح طور پر تیرہویں صدی مسیح سے شروع ہوجاتی ہے۔اس کے محرکات دینی بھی تھے، سیاسی بھی اور اقتصادی بھی۔ دینی محرک واضح ہے کہ اس کا بڑا مقصد مذہب عیسوی کی اشاعت وتبلیغ اور اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنا ہے کہ مسیحیت کی برتری اور ترجیح خود بخود ثابت ہوجائے اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب اور نئی نسل کے لئے مسیحیت میں کشش پیدا ہو۔ چنانچہ اکثر استشراق اور تبلیغ مسیحیت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔مستشرقین کی بڑی تعداد اصلاً پادری ہے ان میں سے ایک بڑی تعداد نسلاً و مذہباً یہودی ہے(ترتیب وترجمہ مولانا سلمان شمسی ندوی:ص122)

(۲)ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں:''مستشرقین عیسائیوں کی وہ جماعت ہے جو بظاہر غیر جانبدار علمی تحقیق کے حوالہ سے متعارف ہے لیکن اگر ان کی سرگرمیوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ مستشرقین کا تبشیری گروہ سے بڑا گہرا تعلق ہے بلکہ حکمرانوں کے ساتھ بھی ان کے روابط بڑے مضبوط ہیں۔آج سے چالیس برس قبل لبنان کے ایک عالم نے بڑی تحقیقی کتاب لکھی جس کا موضوع ہے العلاقہ بین الاستعمار والتبشیر اس میں انہوں نے دلائل کے ساتھ واضح بلکہ ثابت کیا کہ مغربی حکمرانوں کے ساتھ عیسائی مبلغین کا کتنا گہرا ربط ہے۔۔حقیقت یہ ہے کہ نہ تو انھیں اسلامی موضوعات پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی وہ علم اور تحقیق کی کوئی خدمت کرنا چاہتے ہیں وہ تو غیر جانبدارانہ تحقیق کے نام پر اسلام پر طعن کا دروازہ کھولتے ہیں اور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنا ان میں سے بیشتر کا مشن ہے(اسلام اور مغرب تعلقات،ص:308)۔مزید دیکھیے:مستشرقین کی تاریخ،فکر ومقاصد کو جاننے کے لیے:اسلام،پیغمبر اسلام ﷺ اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر از ڈاکٹر عبدالجبار جیلانی؛ مستشرقین کے منہج تحقیق کے لئے:علوم اسلامیہ اور مستشرقین منہاجیاتی تجزیہ اور تنقید از ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی۔

2۔اللہ، کائنات اور انسان: مذاہب کا تصور انسان

فلسفہ اور مذہب دونوں نے انسان کے حوالے سے تین اہم سوالات اٹھائے ہیں اور ان کا جواب دینے کی کوشش کی ہے اور تینوں فلسفہ و مذہب کے مشترک مسائل ہیں: ۱-کائنات کیا ہے؟ ۲-کائنات کا بنانے والا کون ہے؟ ۳-انسان کیا ہے؟ اس کائنات سے اس کا کیا رشتہ ہے اور اس کا کائنات بنانے والے سے کیا تعلق ہے؟ منیر احمد راشد (ماہر تعلیم IBER) اپنے لیکچر 'تعلیمی نفسیات'، (مورخہ: 10 جون 2015 بمقام دعوۃ ریجنل سینٹر، کراچی) اس بات کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: انسان کے سامنے ہمیشہ تین سوالات بنیادی رہے: انسان، کائنات اور خالق کائنات۔

مسیحیت: نے بنیادی اصول کے تحت انسان کو گھٹیا مخلوق باور کیا اور روحانی مراتب کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے اسے فطری آلائشوں سے پاک کرنے کی کوشش کی۔ ترکِ دنیا اور پیدائشی گناہ کا تصور دیا۔ ان کے مطابق ہبوطِ آدم معصیت کے نتیجہ میں ہوا۔ نجات کے لئے کفارہ کا عقیدہ (Doctrine of Atonement) وضع کیا گیا۔

ہندومت: ہندوؤں کے ہاں خالص معاشرتی سطح پر انسانوں کو ناپاک قرار دیا گیا۔ آریہ قبائل کی ہندوستان آمد پر چار ذاتیں (برہمن یا پروہت، کشتری، ویش، شودر) تشکیل دی گئیں، نیز کہا گیا کہ انسانی وجود ناپاک ہے اسے نجات کے لئے کئی جیون اختیار کرنے پڑتے ہیں (کرما [karma]، حلول و آواگون و تناسخ [Reincarnation])۔

بدھ مت: نے بھی دنیوی زندگی کو آلائش کا نام دیا۔ لہٰذا دنیا سے کنارہ کشی اور اشیاء کائنات سے بے رغبتی کی ترغیب دی۔ بدھ مت میں نجات کا مطلب مکمل فنا ہے۔ خواہشات کی کلیتاً نفی یعنی نروان۔

اسلام: اسلام نے انسان کے بارے میں غیر متوازن نظریات کے مقابلہ میں عظمتِ انسانی کا ایک مثبت و متوازن نظریہ پیش کیا اور اس عظمت انسان کا دارومدار بجائے دنیاوی یا غیر اکتسابی عوامل کے تقویٰ و دین داری کو قرار دیا (الاعراف: 7:35)۔ رسول ﷺ نے فرمایا: ''کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر سوائے تقویٰ کے (مسند احمد 411/5)۔ یہ شرف بھی اسلام کو ہی حاصل ہے کہ اس نے علو انسانی کا تصور دیا جبکہ ان بنیادوں پر سوچنے کا شعور بہت کم تھا۔ انسان کے بارے میں قرآن حکیم کا بیان منطقی و مدلل ہے۔ اسلام نے انسان کی

اخلاقی شخصیت، ذمہ دار حیثیت، اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ ہونے کا تصور دیا جو نیابت الٰہی جیسے عظیم فریضہ کی ادائیگی پر مامور ہے (الاعراف 11: 72-71؛ السجدہ 9-7؛ التین :4) نیز مسیحی پیدائشی گناہ کے نظریہ کو رد کر دیا (البقرۃ 2:37)۔ رہبانیت (بے رغبتی و کنارہ کشی) اصطلاحاً سماجی ذمہ داریوں سے راہ فرار و نفسانی ضروریات سے دستبردار ہونا اور کثرت عبادت و مجاہدہ بلکہ نفس کشی کے ذریعہ وصل حق کی جستجو کرنا کی بھی ممانعت فرمائی (الحدید 57: 27) نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **لا رهبانية في الاسلام** ۔اسلام نے انفرادی، عائلی، سیاسی و حربی، سماجی اور معاشی و اقتصادی، غرض تمام شعبہ ہائے زندگی کے متعلق ہدایات فراہم کیں، جن سے اسلام کے ایک مکمل دین ہونے اور شرف انسانیت کا تصور اجاگر ہوتا ہے۔

شریعتی کا تصور انسان اور انسانیت پرستی (Humanism):

علی شریعتی کی تحریر ''اسلام اور تصور انسان'' کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو اسکی بنیادی قدر انسان دوستی نظر آتی ہے۔ لہٰذا اس کا کسی قدر مفصل جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ Humanism, Liberalism, Democracy کے مولف اقبال خان: اشاعت: مشعل پاکستان (جسے سیڈا (نیدر لینڈ) اور ابور فاؤنڈیشن (امریکہ) سے امداد ملتی ہے، لکھتے ہیں: قرون وسطیٰ کا آخری دور the last middle ages کہلاتا ہے۔ 1500-1300ء کا یہ زمانہ وہ تھا جس میں آرٹ اور علم کے میدانوں میں خاص طور پر ترقی ہوئی اور نشاۃ ثانیہ (Renaissance) اور جدید یورپ کی بنیادیں پڑیں لیکن زندگی کے دوسرے شعبے یا تو جیسے تھے ویسے ہی رہے یا تنزل پزیر ہوگئے۔۔اس صورتحال کی ذمہ دار جنگی اور قدرتی آفات تھیں (1337 تا 1453ء برطانیہ فرانس کی مسلسل جنگ رہی اور 1347 و 1350ئمیں طاعون کی وبا سے ایک چوتھائی یورپی آبادی کا صفایا ہوگیا)۔ فیوڈل ازم کی ٹوٹ پھوٹ سے نوابوں کی طاقت کمزور ہوگئی اور بادشاہوں نے ان کو آسانی سے شکست دے کر اپنی طاقت مضبوط کر لی۔ ان بادشاہوں کی طاقت کی بنیاد شہر اور تجارتی طبقہ تھا۔۔ چونکہ چرچ سیاسی امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا تھا، اس کے اور بادشاہوں کے درمیان جھگڑے شروع ہوگئے جن میں بالآخر بادشاہوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ چرچ کے اندرونی جھگڑوں اور بے انتہا کرپشن میں چرچ کا وقار لوگوں کی نظروں میں گر گیا۔ اس کا نتیجہ سولہویں صدی میں اصلاح مذہب (Refomation) کی صورت میں ظاہر ہوا لیکن اس زمانے

میں آرٹسٹ اور عام لوگوں کی توجہ مذہب سے ہٹ کر انسانوں کی دنیا کی طرف ہونے لگی تھی۔ یہ نیا دور انسان دوستی (Humanism) کے نام سے مشہور ہوا۔ نشاۃ ثانیہ کا مطلب ہے دوبارہ پیدا ہونا، یہ اصطلاح اس لئے استعمال ہوئی کہ اس دور میں یورپ اور خاص طور پر اٹلی کے کئی اسکالرز اور فنکاروں نے قدیم یونان اور روم کے آرٹ کے مطالعہ اور ان کلچروں کی روح کا از سر نو اظہار اپنے آرٹ، ادب اور فلسفیانہ تحریروں میں شروع کر دیا۔ یہ دراصل قرون وسطیٰ کی زندگی اور تہذیب کے خلاف بغاوت (علی شریعتی کا تصور بغاوت) تھی، مثال کے طور پر قرون وسطیٰ میں یہ خیال عام تھا کہ لوگوں کا اولین فرض خدا کی عبادت کرنا اور عاقبت کی فکر کرنا ہے اور اس مقصد کے لئے انھیں دنیاوی خواہشات اور مسرتوں کو ترک کر دینا چاہیے۔ رینے سانس کے مفکروں اور آرٹسٹوں نے اس کے خلاف انسانوں کے معاملات اور دنیا کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس نئے رویہ کا سب سے نمایاں اظہار رینے سانس کی مصوری اور مجسمہ سازی میں ہوتا ہے جبکہ قرون وسطیٰ کے آرٹ میں انسانی پیکر کی حیثیت محض ایک علامت کی ہوتی تھی۔

انسانوں دوستوں (Humanists) کا موقف یہ تھا کہ کلاسیکی ادب کی تعلیم کے ذریعے انسان کی روح کو دوبارہ پیدا کیا جا سکتا ہے جو کلاسیکی دور (Greco-Roman Culture) میں کارفرما تھی لیکن قرون وسطیٰ (Dark ages 1100-1453ء) میں ختم ہو گئی تھی۔ یہ روح ایک ''آزادی'' (علی شریعتی کا تصور آزادی) کی روح تھی اور انسان کے اس دعویٰ کا جواز مہیا کرتی تھی کہ وہ عقلی طور پر ایک ''خود مختار'' ہستی ہے (علی شریعتی کا تصور اختیار و انتخاب)۔۔آزادی کی قدر افزائی انسان دوستوں کا اہم موضوع رہا ہے۔۔اس طرح انسان دوستوں نے میکاولی (1469-1527ء) کے طرز فکر کے لئے راہ ہموار کر دی اور میکاولی بھی کئی حوالوں سے انسان دوست ہی تھا۔ اس نے سیاست کی دنیا کو مذہبی اور مابعد الطبعیاتی امور سے پاک کر دیا تھا۔۔انسان دوستی کے سیاق وسباق میں بحثوں نے ایک نئی اہمیت اختیار کر لی کیونکہ ان کا مقصد دنیا میں انسان کی پیش قدمی کی اہلیت کو سمجھنا اور اس کا جواز مہیا کرنا تھا۔۔ہم نشاۃ ثانیہ کی انسان دوستی کو ''جدید سائنس'' (علی شریعتی کا تصور سائنس) کو جنم دینے والے عوامل میں شمار کر سکتے ہیں۔ سولہویں صدی میں بغاوت منطق کے شعبے تک پھیل گئی۔ جدید دور میں انسان دوستی کی اصطلاح کو مندرجہ ذیل نظریوں کی صراحت کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے ۱- کمیونزم ۲- پریگمیٹزم ۳-

روحانیت۴-وجودیت۔۔بیسویں صدی میں انسان دوستی کے نمایاں نظریہ سازوں میں فرانسیسی ادیب اور فلسفی ژاں پال سارتر (مارکسسٹ)(1980-1905ء) کا نام بھی شامل ہے۔سارتر کا تعلق وجودیت (Existentialism) کے فلسفہ سے ہے۔اس نے وجودیت کو انسان دوستی کا ایک رخ قرار دیا ہے۔سارتر نے انسان دوستی کے اپنے نظریئے کی بنیاد اس تصور پر رکھی ہے کہ وجود جوہر پر مقدم ہے۔یہ تصور ''خدا کی عدم موجودگی کے تصور کا نتیجہ ہے''۔اگر خدا موجود نہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان پہلے سے طے شدہ ''مقدر'' کے بغیر پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنا مقدر آپ بنانے اور اپنے ''مقاصد کا انتخاب'' کرنے میں مکمل آزاد ہوتا ہے۔خدا کی عدم موجودگی انسان کی آزادی کی بنیاد ہے کیونکہ اس طرح وہ ہستی موجود نہیں رہتی جو انسان کی حدود، اس کی فطرت اور مقدر کا تعین کر سکے۔یوں انسان مکمل طور پر آزاد ہو جاتا ہے اور ہر شے، ہر قدر کا پیمانہ بھی بن جاتا ہے۔اس حوالہ سے سارتر نے الحاد (Apostasy, Atheism۔خدا کا انکار) سے منطقی نتائج اخذ کرتے ہوئے انسان دوستی (پرستی) کا ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔یاد رہے سارتر نے جدید ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔وجودیت بحیثیت مجموعی اپنی تمام مختلف النوع تفسیروں میں انسانی وجود ہی کو مرکزی مسئلہ مانتی ہے اس سے پہلے کسی فلسفہ نے انسانی وجود کو اتنی اہمیت نہ دی تھی۔گویا Renaissance کا اصل مطلب ہے وحی پر مبنی نقلی علوم کو بے اعتبار سمجھنا اور عقلیت اور انسان پرستی اختیار کرنا ۔ اسی لئے اس تحریک کا دوسرا نام انسان پرستی (Humanism) بھی ہے اور اس تحریک میں جہاں دیگر مغربی فلسفوں نے اپنا حصہ ڈالا وہاں Existentialism کا کردار بنیادی نوعیت کا رہا ہے۔

فلسفہ وجودیت Existentialism کی قدرے وضاحت

انیسویں صدی سائنس پرستی کا زریں عہد تھا مگر اس عہد میں سائنس کے رائج الوقت میکانکی منہاج کے داخلی تضادات اجاگر ہونے لگے اور اس حقیقت کے عام چرچے ہونے لگے کہ یہ منہاج اپنی ماہیت کے اعتبار سے ہمارے حیاتی وقدری مسائل حل کرنے میں نااہل ہے۔سائنس کی یہ ناکامی کوئی معمولی حادثہ نہ تھا کیونکہ اس زمانے میں سائنس علماء کے حلقے تک محدود نہ تھی بلکہ اسے ایک مقبول عام عقیدہ و مذہب کا درجہ حاصل ہو چکا تھا اور اس سے جذباتی امیدیں وابستہ کر لی

گئی تھیں (ڈاکٹر محمود احمد غازی کا مغربی قانون اور فقہ اسلامی کے تقابلی جائزہ کا اقتباس ملاحظہ ہو)۔ یوں سائنس کے بحران سے ایک عظیم ذہنی وجذباتی خلاء پیدا ہوگیا جسے پُر کرنے کے لئے دو فلسفیانہ تحریکیں منظر عام پر آئیں ایک منطقی اثباتیت (ایجابیت) Logical Positivism ہے اور اس کا تعلق ذہنی پہلو سے ہے۔ وجود واقدار کے مسائل حل کرنے کا فرض دوسری فلسفیانہ تحریک نے سرانجام دیا جسے وجودیت (Existentialism) کا نام دیا جاتا ہے۔

Existentialism is a philosophy that emphasizes individual existence, freedom and choice. It is the view that humans define their own meaning in life, and try to make rational decisions despite existing in an irrational universe.

فریڈرک ہیگل (1770-1831ء) کا فلسفیانہ نظام عقل کی مطلقیت کا علمبردار ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کائنات کے جملہ مسائل عقل کی مدد سے حل کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن عقل کی مطلقیت میں یقین غیر عقلی ہے۔ ہمارا روزمرہ کا تجربہ شاہد ہے کہ عقل انسانی فطرت کا ایک جزو ہے اور اس کی صلاحیتیں محدود ہیں یوں اسے مطلق نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس بناء پر کریگارڈ (Soren Kierkegaard۔ 1813-1855ء) نے جو فلسفہ وجودیت کا باوا آدم ہے، ہیگل کی عقل پرستی کے خلاف شدید احتجاج بلند کیا۔ گویا عقل کی مطلقیت سے انکار وجودیت کی اہم صفت ہے۔ درحقیقت وجودیت روایتی مذہب (عیسائیت)، عقل اور سائنس تینوں کی انسانی مسائل حل کرنے میں ناکامی کی صدائے بازگشت ہے۔ یہ مذہبیت، سائنس پرستی، عقل کی مطلقیت اور معروضی حقائق کی بھرمار کے خلاف بے شمار اہم اور غیر اہم نیز درست وغیر درست ردعملوں کا مختصر ومشترک نام ہے۔ وجودیت فرد کی بے مثل انفرادیت پر اصرار کرتے ہوئے فطرت اور طبعی دنیا کی عمومی خصوصیات کے مقابلے میں انسانی وجود کو بنیادی حیثیت دیتی ہے۔ پروفیسر بختیار حسین صدیقی کے بقول وجودیت وہ طرز فکر ہے جو انسانی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس کی ترکیب کے ذہنی اور عقلی پہلوؤں کی بجائے اس کے جذبی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ فرد کو ''رواجوں اور روایتوں کی زنجیروں'' سے نجات دلانے کی سارتر کی سعی کو وجود غیر مصدقہ (unauthentic existence) سے وجود مصدقہ (authentic existence) کی جانب سفر کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ کریگارڈ کا ''مذہبی فرد'' اور نطشے کا ''فوق البشر (Superman)'' اپنے سامنے یہی نصب

العین رکھتے ہیں۔ یاد رہے 1960 کے عشرے میں سارتر کو امریکا اور یورپ کے انقلاب پسند طلباء (غالباً بشمول علی شریعتی) نے اپنا ہیرو بنایا۔ وہ دنیا بھر میں آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے لئے ایک علامت کی حیثیت رکھتا تھا۔ الجزائر پر فرانسیسی تسلط ختم کرنے کے لئے جب سارتر نے تحریک چلائی تو مخالفین نے فرانسیسی صدر چارلس ڈیگال کو مشورہ دیا کہ وہ سارتر کو گرفتار کر لیں۔ ڈیگال نے کہا ''میں سارتر کو گرفتار کیسے کروں؟ سارتر تو فرانس ہے'' سارتر اور کیموس نے انیسویں صدی کے علمی مباحث میں under-current کی حیثیت سے کارفرما رہنے والے فلسفے (وجودیت) کو باضابطہ شکل دی اور بتایا کہ اگر دنیا کو بہتر بنانا ہے تو انسان کی انفرادی حیثیت (Individuality) کو اولیت دینا ہوگی۔

مسیحیت اور انسان پرستی

عیسائیت، انسان پرستی کے اس فلسفہ کو رد کرتی ہے لہٰذا پادری لوئیس برک ہاف، لکھتے ہیں:
''فلسفہ کے میدان میں یہ (انسان دوستی) مسیحی علم الانسان (anthropology) کی حقیقی مخالف ہے۔ یہ انسان کی اپنے آپ کو مرکزی حیثیت دینے کی فطری خواہش کی عکاس ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان اپنی جبلی قوتوں سے اپنا اور دنیا کا آقا خود بن سکتا ہے۔۔ لیکن یہ فوق الفطرت کا انکار کر کے اور محض اس بات پر انحصار کرنے سے کہ انسانی وسائل کافی ہیں، انجیل کی جڑ پر کلہاڑا رکھ دیتی ہے'' (مسیحی علم الکلام، ص: 181)۔ (جاری ہے)

انگلش میڈیم پر فوراً پابندی لگائی جائے

سپریم کورٹ نے اردو کے حق میں فیصلہ کر دیا ہے اور مرکزی حکومت نے اس پر عمل درآمد کے لیے حکم نامہ بھی جاری کر دیا ہے۔ اللہ کرے اس پر عمل بھی ہو۔

ہم حکومت پاکستان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا فوری حکم جاری کرے اور انگلش میڈیم پر فی الفور پابندی عائد کی جائے۔ ہم اردو کے حامیوں اور خصوصاً پاکستان قومی زبان تحریک کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں۔

ڈاکٹر علی شریعتی. ڈائیلاگ

ڈاکٹر محمد اظہار الحق ☆

ڈاکٹر علی شریعتی اور تصور انسان

اپریل ۲۰۱۵ء کے البرہان میں ڈاکٹر محمد امین نے ڈاکٹر علی شریعتی کے انسانیت اور اسلام (نہ کہ انسان اور اسلام) پر مضمون کو 'شوق' سے پڑھنے کے بعد اسے 'مغرب گزیدہ' پایا اور انہیں 'مایوسی' ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول علی شریعتی اسلام کا 'صحیح تصور پیش نہ کر سکے بلکہ وہ مغربی لبرل ازم سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔' اس کے بعد ڈاکٹر محمد امین صاحب نے آٹھ سطروں پر مشتمل دو پیراگرافوں میں ڈاکٹر علی شریعتی کے مضمون کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے اور ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ 'جو انہوں نے کہا ہے وہ غلط نہیں ہے لیکن پورے سچ کا اظہار نہیں کیا۔'

مجھے معلوم نہیں کہ ڈاکٹر امین صاحب نے ڈاکٹر علی شریعتی کے افکار کو اور اس موضوع سے متعلق ان کے دیگر مضامین کو بھی پڑھا ہے یا نہیں، لیکن بادی النظر میں یہ لگتا ہے کہ امین صاحب نے ان کا صرف ایک ہی مضمون پڑھا ہے، خوش قسمتی سے میرے پاس ڈاکٹر علی شریعتی کے مضامین کا ایک مجموعہ 'افکارِ شریعتی' کے نام سے چھپا ہوا موجود ہے اور مجھے براہِ راست موضوع زیر بحث تک رسائی حاصل ہے۔

موضوع پر بحث سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر علی شریعتی کے مضمون کے پس منظر کے طور پر ان کے اور ان کے دور کے حالات پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے تاکہ بات سمجھنے میں آسانی ہو۔

ڈاکٹر علی شریعتی ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ۱۹۷۷ء میں ۱۹ جون کو وفات پائی۔ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے پیرس میں سوربون یونیورسٹی سے سماجیات (سوشیالوجی) میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے فلسفہ، علم کلام اور سماجی علوم کا اسلامی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا۔ تاریخ مذاہب کا تقابلی مطالعہ ان کی خصوصی توجہ کا موضوع رہا۔

علی شریعتی کی زندگی کا ابتدائی دور مغربی سرمایہ داری اور جاگیرداری کا دور رہا، جس نے ایک

☆ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ وعربی، گومل یونیورسٹی، ڈیرہ اسماعیل خاں

عرصے تک مغرب کو اپنی گرفت میں لیے رکھا اور اب تک اس کی مضبوط گرفت قائم ہے۔ان کے شباب ہی میں مارکسزم نے مشرقی یورپ کو اپنی گرفت میں لیا اور یونائٹڈ سٹیٹس آف سوویٹ ری پبلک میں مارکسزم کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اس نے باہر کی دنیا کو بھی متاثر کرنا شروع کیا، جس کے نتیجے میں ایران کے اندر بھی اس کے اثرات پڑنے شروع ہوئے۔اس سے پہلے شہنشاہیت کے دور میں مغربی تہذیب نے پہلے سے ڈیرے جمائے ہوئے تھے۔اس طرح ایران کی اس دور کی پہلی نسل کا ایک طبقہ مغربی تہذیب کا دلدادہ تھا، جب کہ اگلی نسل کا ایک طبقہ روسی مارکسزم سے متاثر ہونے لگا اور اس کے اثرات ایرانی سیاست میں نظر آنے لگے۔

یہی وہ دور تھا جس میں ڈاکٹر علی شریعتی نے نہ صرف مختلف تہذیبوں، معاشروں، مذاہب اور ان کے عروج و زوال کا مشاہدہ کیا بلکہ ان کا بغور مطالعہ کیا۔ چونکہ وقت کی ان دو غالب تہذیبوں اور نظاموں نے ایران کی سیاست و معاشرت کو متاثر کیا تھا اور نئی نسل کے اندر ان دونوں نظاموں کے خلاف ردّعمل پایا جاتا تھا، اور وہ مثبت تبدیلی کی بھی خواہاں تھی، اس نسل کی ترجمانی اور رہنمائی کا اعزاز ڈاکٹر علی شریعتی کو حاصل ہوا۔

اپنے ملکی ماحول اور حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے، دلیل اور تجزیے کی بنیاد پر نوجوان نسل کو مغربی اور مارکسی تہذیبوں کی بنیاد اور ان کی کمزوری اور اس کے مقابل میں اسلامی اصولوں پر مبنی مضبوط اور برتر سماجی نظام کی طرف دعوت و تربیت کا کام ڈاکٹر علی شریعتی نے علمی بنیادوں پر کیا اور ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا۔ان کے انداز نے نوجوان نسل کو بہت متاثر کیا یہاں تک کہ تہران میں انہوں نے موسمِ گرما میں کلاسز شروع کیں تو چھ ہزار طلبہ نے ان میں داخلہ لیا اور جب ان کی پہلی کتاب شائع ہوئی تو پہلا ایڈیشن ساٹھ ہزار کی تعداد میں فروخت ہوا۔

اب اصل موضوع بحث کی طرف آتے ہیں جس کے بارے میں ڈاکٹر امین صاحب کہتے ہیں کہ 'ہم نے اس کی فکر کو بھی، اس مضمون کی حد تک، مغرب گزیدہ پایا، اس لکچر میں ڈاکٹر شریعتی اسلام کا صحیح تصور انسان پیش نہیں کر سکے، بلکہ وہ مغربی لبرلزم سے متاثر دکھائی دیتے ہیں'۔

ڈاکٹر صاحب کے اس تبصرے کو پڑھا تو میں نے ڈاکٹر شریعتی کے مضمون کو ان کی کتاب سے، جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، مطالعہ کیا کیونکہ تحقیق کا بنیادی سبق یہی ہے کہ بنیادی ذریعے تک رسائی حاصل کی جانی چاہیے۔ مجھے خود مختلف سطح پر تحقیق کے دوران اس تلخ حقیقت سے

واسطہ پڑا ہے کہ بڑے بڑے لکھنے والے اصل کتاب تک پہنچنے کی بجائے ثانوی ذرائع پر تکیہ کر بیٹھتے ہیں اور وہ خبر سرے سے اصل کتاب میں موجود ہی نہیں ہوتی۔ یا پھر بعض اوقات ایک مصنف ایک بات کو کسی اور سیاق وسباق کے حوالے سے لکھتا ہے جب کہ پڑھنے والا سرسری طور پر پڑھ کر اس سے بالکل مختلف اور غلط نتائج اخذ کر بیٹھتا ہے۔ مجھے یہاں اپنے والد مرحوم کے دیوبند کے ایک زمیل، جو کہ پشاور میں ایک کالج کے پرنسپل بھی تھے، کے ساتھ ملاقات کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ میں اس وقت عربی میں جامعہ پشاور سے ایم اے کر رہا تھا اور ان کے پاس کسی علمی کام سے گیا، تو وہ مجھ سے مطالعۂ کتب کے حوالے سے پوچھنے لگا کہ میں کس کس کی کتابیں پڑھتا ہوں۔ میں نے بتایا کہ سید مودودی، سید قطب اور ابوالحسن علی ندوی کی کتب پڑھتا ہوں۔ تو انہوں نے کہا کہ مودودی صاحب نے تو اپنی تفسیر میں ابراہیم علیہ السلام کو مشرک کہا ہے۔ ان کی کتابیں نہ پڑھا کریں۔ میں نے واپسی پر مذکورہ جلد کھول کر مطلوبہ آیات کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ مودودی صاحب تو ان آیات کے پڑھنے پر ایک عام قاری کے ذہن میں اُٹھنے والے سوالات کا جواب دے کر ان کے ذہن کو شک سے پاک کرنا چاہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام سے شرک کبھی سرزد نہیں ہوا، بلکہ حق کی تلاش میں مختلف مراحل سے گزر کر وہ حق تک پہنچ گئے۔ تو مجھے ایک عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پروفیسر کی اردو دانی اور علم پر بھی حیرت ہوئی اور ان کی دیانت داری پر بھی۔

مقصد کی طرف آتے ہوئے، میں نے جب علی شریعتی کی کتاب کا خود مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان کا موضوع 'اسلام کا انسان مطلوب' ہے ہی نہیں کہ وہ اسلام کے مطلوبہ انسان کی صفات کی جزیات پر بحث کرتا۔ وہ تو اپنے ایران کے مخاطب قاری کو یہ بتا رہا ہے کہ دنیا میں مختلف تہذیبوں، مذہبوں اور نظاموں اور ان کے راہنماؤں نے انسان کی کیا تعریف کی ہے، اور اپنی تعریفات کی روشنی میں انہوں نے کس طرح انسان کو 'خودمختاری' آزادی، خودشعوری اور فطرت پر حاکمیت حاصل کرنے سے محروم رکھنے اور 'انسان پر ظالمانہ انداز سے حکمرانی' کرنے کے لیے ایک حربے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس طرح علی شریعتی یونان اور مغربی مفکرین کی انسان کی تعریف کی خامی کو اجاگر کر کے نسل نو کے ذہن سے مغرب کی فکری برتری کو ختم کر کے ان کے سامنے اسلام کے تصور انسانیت کی تعریف بیان کرتا ہے، اور یہ مقصد سامنے رکھتا ہے کہ کس طرح اسلام میں 'مخلوقات کے درمیان انسان کو ایک مرکزی وجود کی حیثیت ملی ہے جو روح مطلقہ کا حامل ہے،

خدا کی امانت کا بوجھ اٹھانے کی ذمہ داری رکھتا ہے اور یوں مطلق صفات کی تحصیل کو خود پر واجب پاتا ہے۔'دوسرے الفاظ میں اسلام انسان کو عمل کی آزادی دیتا ہے اور عمل کے لیے راہنمائی بھی دیتا ہے، اور ساتھ ہی بتاتا ہے کہ خدا نے تجھے جانوروں اور نباتات کی طرح مجبور محض نہیں بنایا ہے۔لہٰذا تم اپنے اصل مقام تک، جدوجہد کر کے پہنچ سکتے ہو اور اسے دوبارہ حاصل کر سکتے ہو۔ اس مقصد کے لیے اسلام اسے عمل کی راہ سجھاتے ہوئے راہنمائی دیتا ہے کہ:وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی o وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی o ثُمَّ یُجْزَاہُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی. اس طرح شریعتی صاحب نے اپنی بات پوری طرح واضح کر دی ہے کہ مغرب یونان اور کیتھولک راہنماؤں نے انسان کی جو تعریف کی ہے اس میں وہ ازلی گناہ گار ہے، آسمانی قوتیں اس کی دشمن ہیں اور وہ مجبور و مقہور ہے، اسے کوئی آزادی اور اختیار نہیں۔ جب کہ اسلام اسے ایک ایسے روپ میں پیش کرتا ہے کہ وہ زمین میں نائب ہے، وہ صاحب عقل و ارادہ ہے۔ پوری کائنات اس کے لیے کھلی ہوئی کتاب ہے اور خدا کی دی ہوئی رہنمائی میں پوری کائنات کے راز ٹٹول بھی سکتا ہے اور ان سے اپنی فلاح کے لیے استفادہ بھی کر سکتا ہے۔

یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ ڈاکٹر علی شریعتی کا موضوع سخن سرے سے یہ ہے ہی نہیں کہ اسلام اس مذکورہ انسان کے اندر کیا صفات بتاتا ہے اور اس کے اندر کون کون سی ذیلی صفات ہونی چاہیے، جن کی تفصیل ڈاکٹر امین صاحب نے پیش کی ہے اور انہوں نے اپنے تئیں شریعتی صاحب کے موضوع میں کمی کو پورا کر دیا ہے۔ڈاکٹر شریعتی کہیں بھی مغرب گزیدہ نظر نہیں آتے، بلکہ مغربی مفکرین کے تصور انسان کا بھرپور تجزیہ کرتے ہیں اور اسے انسانیت کے حق میں مضر سمجھتے ہیں اور نوجوان نسل کو ترغیب دیتے ہیں کہ دوسروں کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے اسلامی نظریئے کی طرف دیکھنا چاہیے اور وہاں سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔

میں پوری دیانت داری سے یہ سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر امین صاحب کا مذکورہ تبصرہ کسی بھی طرح سے درست نہیں۔ان کے اکثر ناقدانہ تبصرے اصل موضوع بحث سے ہٹ کر ضمنی نکات پر ہوتے ہیں اور جس مقصد کے تحت مصنف نے مضمون لکھا ہوتا ہے، عام قاری کی توجہ اصل مقصد سے ہٹا کر انہیں بلاضرورت بحث میں الجھا دیا جاتا ہے۔امید ہے میری ان گزارشات کو مثبت انداز میں لیا جائے گا اور دوسرے معنی نہیں پہنائے جائیں گے۔

پاکستانیات مدیر

پاکستان سے دہشت گردی کیوں ختم نہیں ہورہی؟

پاکستان میں ہر روز ہلاکتیں ہوتی ہیں، بم پھٹتے ہیں، گولیاں چلتی ہیں، حملے ہوتے ہیں۔ کراچی میں، بلوچستان میں، فاٹا میں اور ہمارا دل دکھتا ہے اور ہم یہ سوچتے ہیں کہ وطن عزیز سے یہ دہشت گردی ختم کیوں نہیں ہوتی؟ کیوں نہیں ہوسکتی؟

ہمیں ڈر ہے کہ پاکستان کے سیاسی وعسکری رہنما یہ دہشت گردی ختم نہیں کر سکتے! اور اس موقف پر پہنچنے کے لیے افلاطون اور بقراط ہونا ضروری نہیں۔ سامنے کی بات ہے اور ہم سب کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک مریض اگر کسی تیسرے درجے کے حکیم کے پاس بھی جائے تو دوا تشخیص کرنے سے پہلے حکیم صاحب کوشش کرتے ہیں کہ مرض کا سبب سمجھ سکیں۔ اس کے لیے وہ مریض سے سوال پہ سوال کرتے ہیں کہ یہ تکلیف کب سے ہے؟ اس کی علامتیں کیا ہیں؟ کون سی چیز کھانے سے تکلیف بڑھتی ہے..... وغیرہ وغیرہ۔

تو جب ایک معمولی حکیم ایک معمولی مرض کے علاج کے لیے اس کا سبب جاننے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے علاج کو کامیاب کرنے کے لیے اسباب مرض دور کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ہماری سیاسی وعسکری قیادت کیسے اس دہشت گردی پر قابو پاسکتی ہے جب تک وہ اسباب مرض دریافت نہ کرے اور ان اسباب کو دور کرنے کی کوشش نہ کرے۔

یہ دہشت گردی جس کی ابتداء فاٹا سے ہوئی، اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب امریکہ کا افغانستان پر حملہ ہے جو وہاں کی اسلامی حکومت حیلے بہانے ختم کرنا چاہتا تھا اور پاکستان کو دباؤ میں لا کر، اس کے لیے مسائل پیدا کر کے، اسے کمزور کرنا اور توڑنا چاہتا تھا، اس کی ایٹمی صلاحیت اور اسلامی شناخت تباہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پاکستان سے مطالبہ کیا کہ وہ قبائلی علاقوں سے مجاہدین کو افغانستان جانے سے زبردستی روکے۔ ظاہر ہے یہ امریکہ کی جنگ تھی۔ پاکستان نے قبائلیوں کو افغانستان جانے سے زبردستی روکا تو مسلح تصادم شروع ہوگیا۔

پھر امریکا بھارت کو وہاں گھسا لایا اور اس نے بھارت و افغانستان کی مدد سے در انداز بھجوانے شروع کیے، پاکستانی طالبان میں اپنے آدمی داخل کیے، انہیں ڈالر، اسلحہ اور تربیت سے

نوازا اور پاکستان کے خلاف متحرک کیا۔ ادھر پاکستان کے اندر اس نے اپنا انٹیلی جنس نیٹ ورک قائم کیا اور اپنے جاسوس اور کنٹریکٹر (پرائیویٹ آرمی کے دہشت گرد) یہاں داخل کیے۔ ان سب نے مل کر پاکستان میں دہشت گردی کو فروغ دیا اور اہل پاکستان پچھلے تیرہ برس سے اس عذاب کو بھگت رہے ہیں۔ اس کے پچاس ہزار سے زیادہ سویلین اور فوجی مارے جا چکے ہیں اور معیشت تباہ ہو چکی ہے لیکن ہماری سیاسی اور عسکری قیادت اس دہشت گردی پر قابو نہیں پا سکی اور ظاہر ہے پا بھی نہیں سکتی جب تک وہ اصل اسباب کو دور نہ کرے۔ ۱۳ سال بعد اسے ہمت ہوئی ہے کہ وہ بھارت کا نام لے سکے جب کہ امریکہ کا نام لینے کی ہمت اب بھی اس میں نہیں۔

بہرحال، اس کا حل یہ ہے کہ پاکستان اس امریکی جنگ سے باہر آ جائے، قبائلیوں سے صلح صفائی کر لے، ان کا نفاذِ شریعت کا مطالبہ مان لے اور مقامی آبادی کی مدد سے امریکی و بھارتی ایجنٹوں کا قلع قمع کر دے تو ہر طرف امن وسکون ہو جائے گا لیکن ہماری قیادت اس بات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔

اللہ کرے کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ہماری سیاسی و عسکری قیادت امریکی چنگل سے نکل سکے اور اسلامی و ملکی مفادات پر ہر دوسری چیز کو تج دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو عوام کی بھرپور تائید اسے حاصل ہوگی اور پاکستان عزت و وقار کے ساتھ امن واستحکام کی منزل کی طرف گامزن ہو سکے گا۔ کاش ایسا ہو جائے!

امریکہ کا اصل چہرہ

اخباری اطلاعات کے مطابق پینٹاگون نے فوجی حکمت عملی سے متعلق دستاویزات جاری کی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ پوری دنیا کو فتح کیے بغیر امریکہ کا وجود خطرے میں ہے۔ اپنی بقاء کے لیے دوسرے ملکوں کو جنگوں میں اُلجھا کر رکھنا ہوگا۔ امریکہ واحد سپر پاور نہ رہے تو ہم سب چلتی پھرتی نعشیں ہیں۔ امریکہ کے لیے روس سب سے بڑا خطرہ ہے، کرغیزستان سمیت ۱۱ ملکوں میں حکومتوں کا تختہ الٹنے کے لیے کام جاری ہے۔

تبصرۂ کتب مدیر

'نئے اور پرانے اسلام کی بحث'

از آفتاب عروج، چنیوٹ

۸۸صفحات کا یہ کتابچہ دراصل ایک طویل ردّعمل یا خط ہے جو مولف نے لاہور کے معروف دیوبندی عالم دین مولانا مفتی ڈاکٹر عبدالواحد صاحب کے اس موقف کے خلاف لکھا ہے جو انہوں نے عمار خان ناصر کے 'نئے اسلام' کی سرکوبی کے لیے اختیار کیا۔ مولف اگرچہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا تعلق کسی مکتب فکر سے نہیں لیکن یہ تحریر اس کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ ان کا تعلق مغرب زدہ متجددین کے اس دائرہ فکر سے ہے جس کے سرخیل سرسید، غلام احمد پرویز اور معاصرین میں پاکستان میں جاوید احمد غامدی اور بھارت میں راشد شاذ وغیرہ ہیں۔

مولف نے کوئی نئی بات بھی نہیں کہی۔ وہی پرانی غلطیاں، غلط فہمیاں، مغالطے اور الزامات کہ مسلم زوال اور معاشرے میں فساد و بگاڑ کے ذمہ دار صرف علماء ہیں 'جو اسلام کے نام پر کاروبار کرتے ہیں' جنہوں نے 'ریاست کے اندر ریاست' قائم کر رکھی ہے اور جو 'مذہبی ملوکیت کی آمریت' کی 'موروثی' شکل اختیار کر چکی ہے، (ص۴، ۵) 'فتویٰ' کے ادارے کی مذمت (ص ۴۸) جدت افکار کے حوالے سے مغربی دنیا کی تعریف اور مسلمانوں کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ 'یہ بہانے بناتے ہیں کہ ہمیں مغربی علوم نے گمراہ کر دیا۔ یہود و ہنود کی سازش کی وجہ سے ہم گمراہ ہو گئے'۔ سنت کا یہ کہہ کر استخفاف کرتے ہیں کہ 'قرآن کریم کے سوا کوئی دوسرا ایسا ذریعۂ علم نہ ہے جو لاریب ہو' (ص۱۰) علماء کے اختلافات کی یہ کہہ کر مذمت کہ 'قرآن نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے' (ص۳۰)

ائمہ کرام اور فقہی مسالک کی مذمت کا ایک انداز ملاحظہ فرمائیے 'گزشتہ ہزار بارہ سو سال میں ہمارے ایسے امام گزرے ہیں جنہوں نے قرآنی تعلیمات کی بجائے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتب و رہنمائی سے مسلمین کو مجرمین میں تبدیل کر دیا' (ص۶۰)۔

مولانا حسین احمد مدنی کی مذمت کہ ان کا موقف 'مسلم لیگی ٹیم میں اعلیٰ مقام و مرتبہ کی عدم

دستیابی کا ردعمل' تھا (ص ۱۷)۔عمار خان ناصر کی حمایت میں مفتی عبدالواحد صاحب کو کہتے ہیں کہ آپ کی تحریر پڑھ کر 'افسوس اور مایوسی' ہوئی کہ آپ کے پاس لکھنے کو اور کوئی موضوع نہیں اور 'دوسروں کی ہجو گوئی، کسی کو کافر' کسی کو مرتد، کسی کو منکر حدیث اور کسی کو مغرب کا ایجنٹ جیسے نام دے کر اچھے بھلے صاحب علم وقلم دانشور شخصیات کی تذلیل کر کے انہیں کرب واذیت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور انہیں یہ اشتعال انگیز مشورہ دیتے ہیں کہ 'آپ نے خواہ مخواہ عرب ملوکیت زدہ اسلام کے دفاع میں اتنی بڑی کتاب لکھ ڈالی۔عمار بے چارہ ابھی بچہ ہے، [آپ کی طرح] آداب غلامی سے واقف نہیں ہے اور کبھی کبھی آپ کے تصوراتی وخیالی بتوں کے ساتھ ہلکی پھلکی چھیڑ خوانی کرتا رہتا ہے.....لہٰذا آپ پریشان نہ ہوں' (ص ۲۸)۔

پرویز کے نظام ربوبیت کی حمایت کہ رسول کے بعد اب اس کے اختیارات ریاست استعمال کرے گی (حاشیہ ص ۶۴) مسلم تاریخ کو سیاہ کر کے پیش کرنا کہ 'گزشتہ ہزار بارہ سو سالوں میں مسلم امہ کوئی عالمی سطح کا لیڈر و رہنما' کوئی سائنسدان پیدا نہیں کر سکی' (ص ۵۸)۔یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ 'جب معاشرہ مذہب کی آڑ میں منافقت کی انتہا کو پہنچ جائے تو ساقی کو' گانے والے کو، شراب کو اور گیت کو غنیمت سمجھ' (ص ۵۹) اور قوم کو مایوسی کا پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہارے کرتوتوں کا یہی انجام ہونا چاہیے کہ تم پہ یہ عذاب آئے اور تم مٹ جاؤ (ص ۸۷)

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے اور پورا کتابچہ ایسے ہی رطب و یابس خیالات سے بھرا ہوا۔ہے ان کمزور اور فضول باتوں کا تفصیلی جواب دینے کے لیے پوری کتاب درکار ہے جس کے لیے راقم کے پاس نہ وقت ہے اور نہ ذوق۔شائد قبلہ مفتی عبدالواحد صاحب ان کو جواب دیں۔ہم ایک تو مولف کی راست فکری کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں فکری انتشار سے نجات دے اور صراطِ مستقیم پر گامزن فرمائے اور دوسرے انہیں مشورہ دیتے ہیں کہ محمد ظفر اقبال صاحب کی تازہ کتاب 'اسلام اور جدیدیت کی کشمکش' مطالعہ فرمائیں جو کتاب سرائے اردو بازار لاہور سے مل سکتی ہے۔

'نئے اور پرانے اسلام کی بحث' نامی کتابچہ مصنف سے مکان نمبر 11/9w، گوجر چوک، سیٹلائٹ ٹاؤن، چنیوٹ کے پتے پر خط لکھ کر منگوایا جا سکتا ہے۔

سرگزشت ایام از حافظ نذر احمد

یہ ایک مرد درویش کی داستان حیات ہے۔ حافظ نذر احمد (۱۹۱۹-۲۰۱۱ء) معلم بھی تھے، مربی بھی، داعی بھی تھے اور مترجم قرآن بھی۔ نام ونمود سے گریز اور خاموشی سے دین کی سنجیدہ خدمت ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ یہ کتاب جو ڈاکٹر سفیر اختر نے مرتب کی ہے، اس کے تین حصے ہیں: ایک میں حافظ صاحب کی خودنوشت ہے۔ دوسرے میں اعزہ کے تاثرات اور تیسرے میں ان کے دوست احباب اور معاصرین کی یادیں اور ان کے کام کا تذکرہ ہے۔ ۲۷۳ صفحات کی یہ کتاب مسلم اکادمی ۱۸/۲۹ محمد نگر لاہور (042-36293423) سے طلب کی جاسکتی ہے، اس پر قیمت درج نہیں۔

اردو نعت میں تجلیات سیرت مرتبہ سید صبیح رحمانی

نعت نامے بنام صبیح رحمانی مرتبہ ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

راقم شاعر ہے نہ ادیب اور نہ صحافی - مقصدیت کے جوش نے کچھ لکھنے کی راہ سجھائی جسے تکرار نے پختہ کر دیا۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو شاعر یا ادیب ہیں اور جن کے تحت الشعور میں دین سے وابستگی کی اساس پر ذوق سخن کی کسی جہت نے اپنی شمع جلا رکھی ہے جن میں سے ایک اشرف صنف نعت رسول مقبول ﷺ ہے۔ جیسا کہ ان کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ صبیح رحمانی صاحب نے کراچی میں نعت ریسرچ سنٹر قائم کر رکھا ہے۔ نعت رنگ کے نام سے ایک جریدہ شائع کرتے ہیں اور نعتیہ نظم ونثر کی اشاعت ان کی محبوب مصروفیت ہے۔ اردو نعت میں تجلیات سیرت میں انہوں نے اردو نعت میں سیرت نگاری کے حوالے سے قیمتی مضامین جمع کیے ہیں۔

'نعت نامے' صبیح رحمانی کے نام خطوط کا مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر محمد سہیل شفیق صاحب (شعبہ تاریخ کراچی یونیورسٹی) نے نہایت سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ تجلیات سیرت صفحات ۳۲۸ قیمت ۳۵۰ روپے اور نعت نامے صفحات ۹۳۴ قیمت ۱۰۰۰ روپے۔ ناشر، نعت ریسرچ سنٹر بی ۳۰۶، بلاک ۱۵، گلستان جوہر کراچی فون 0333-2457575